مظفر وارثی کی خود نوشت "گئے دنوں کا سُراغ" اور آفاق صدیقی کی خود نوشت "صبح کرنا شام کا": تقابلی مطالعہ

یہ مقالہ

محمد ارشد

رولنمبر: ۳۱، سیشن ۲۰۲۱ء-۲۰۲۳ء خزاں

برائے حصول ڈگری ایم فل اردو

منہاج یونیورسٹی، لاہور (پاکستان)

میں پیش ہوا

یہ تحقیقی کام زیر نگرانی

ڈاکٹر سامیہ احسن

مکمل ہوا

فہرست

صفحہ نمبر

پیش لفظ

تاریخ انسانی پر نگاہ ڈالی جائے تو ازل سے ہی انسان قصہ گو رہا ہے۔ اپنی زندگی کی مہمات، کارنامے، ارادے، تکالیف اور کیفیات بیان کرنے کے لیے اُسے ہمیشہ سے ایک سامع کی ضرورت رہی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ تہذیب نے ترقی کی تو کاغذ کی ایجاد ہوئی اور یوں ہر وہ بات جو اظہار چاہتی ہے تحریر کی جانے لگی۔ شعر و ادب کو اصناف میں تقسیم کیا گیا تو آپ بیتی اس حوالے سے ثروت مند ٹھہری کہ اس کا مرکزی کردار خود لکھنے والے کی اپنی ذات قرار پائی۔

آپ بیتی لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ ایک اچھا آپ بیتی نگار وہی ہے جو اپنے ذاتی تجربات سے اپنے قاری کو مستفیض کرنے کا سچا جذبہ رکھتا ہو۔ آپ بیتی کے لیے خود اظہاریت، سچائی اور جمالیت پسندی لازمی عناصر ہیں۔ ایک اچھی آپ بیتی جہاں ذات کے حوالے سے آئینہ دار ہوتی ہے وہاں تاریخ، تہذیب اور عہد کی پہچان کرانے میں بھی معاون و مددگار ہوتی ہے۔ آپ بیتی میں مصنف اپنے عہد اور اپنے عہد کے حوالے سے اپنی ذات کی دریافت اور بازیافت کرتا ہے۔

اردو میں آپ بیتیوں کا بیش قیمت سرمایہ موجود ہے۔ آپ بیتیوں کی اتنی بڑی تعداد کے پیشِ نظر ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحقیقی و تنقیدی جائزہ بھی لیا جاتا رہے۔ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر اس حوالے سے کافی کام ہو چکا ہے لیکن راقم الحروف نے تحقیق و تنقید کے جدید نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اردو ادب کی آپ بیتیوں کا نئے زاویے سے جائزہ لیا ہے۔ مشاہیر کی آپ بیتیاں ملک کی ترقی اور قوم کے اعمال کا جائزہ بھی ہوتی ہیں۔ اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے راقم نے مظفر وارثی اور آفاق صدیقی کی آپ بیتیوں کا تقابل اور موازنہ کیا ہے۔ راقم نے "صبح کرنا شام کا" اور "گئے دِنوں کا سُراغ" کا عمیق مطالعہ اور شرح و نسبت کے ساتھ بسیط جائزہ لیا ہے۔

آپ بیتی کی حیثیت ایک اہم تاریخی دستاویز جیسی ہوتی ہے کیونکہ اس میں چھوٹے بڑے سیاسی و معاشرتی معاملات کہیں اختصار اور کہیں جامعیت کے ساتھ رقم کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کے مطالعے، جائزے اور تجزیے سے اُس عہد کا سارا منظر اپنی مجموعی کیفیات کے ساتھ نظر کے سامنے آجاتا ہے اور اُس دَور کی سیاسی و معاشرتی تاریخ اپنے تمام تر نشیب و فراز، تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے۔

ادبی تحقیق کے حوالے سے یہ مقالہ اپنے موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہمہ جہت مقاصد کا حامل ہے کیونکہ اس مقالے سے اردو ادب کے دو اہم اور سر کردہ ادیبوں کے حالاتِ زندگی اور تجربات سے آگاہی ممکن ہو پائے گی۔ نیز اُن کی آپ بیتیوں کی ادبی حیثیت کا تعین کرنے میں مدد ملے گی۔

میں نے اس مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب خود نوشت کے تعارف اور تفہیم پر مشتمل ہے ۔ آپ بیتی یا خود نوشت سوانح نگاری کی ایک ذیلی قسم ہے۔ خود نوشت کسے کہتے ہیں؟ سوانح عمری اور خود نوشت میں کیا فرق ہے،؟ ایک خود نوشت کا کن حدود و قیود یا ضابطوں کا پابند ہونا چاہیے؟ سوانح نگاری کا آغاز کب ہوا اور اردو زبان میں سوانح نگاری کہاں سے شروع ہوئی؟ اردو کے مشہور سوانح نگاری کون ہیں؟ سوانح عُمریوں کی اقسام کون کون سی ہیں،؟ کون سی اصناف میں آپ بیتیوں کے اثرات پائے جاتے ہیں،؟ اردو کی مشہور خود نوشتیں کون سی ہیں اور کون سے آپ بیتی نگار اپنی کن خصوصیت کی وجہ سے اس صنفِ ادب میں مشاہیر کی صف میں شامل ہوئے۔ اِن سب سوالوں کے جوابات باب اوّل میں موجود ہیں۔

دوسرا باب شاعر، نعت گو اور آپ بیتی نگار مظفر وارثی کی سوانح پر مشتمل ہے۔ مظفر وارثی ہندوستان، میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے لے کر ہجرت اور پاکستان آمد کے بعد ۲۰۰۰ء تک کے واقعات، مشاعروں اور نجی و فنی زندگی کا احاطہ اسی باب دوم میں کیا گیا ہے۔ خاندانی پسِ منظر، ادبی زندگی، آباؤ اجداد، خانگی زندگی، شخصی خصائل اور تصانیت کا ذکر باب دوم میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں محمد آفاق صدیقی نامور شاعر، مترجم، استاد اور آپ بیتی نگار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آفاق کا تعلق ہندوستان میں فرخ آباد سے تھا۔ ہجرت کے بعد وہ سکھر اور پھر کراچی منتقل ہو گئے۔ اُنھوں نے چالیس سے زائد کُتب لکھیں اور اُنھیں اُن کی خدمات کے عوض تمغہ حُسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔ باب سوم میں ہر ممکن طریقے سے آفاق صدیقی کی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مقالے کا چوتھا باب "گئے دنوں کا سُراغ" اور "صبح کرنا شام کا" کا تقابلی مطالعہ کے نام سے ہے۔ جس میں دونوں آپ بیتیوں کا موازنہ و تقابل کیا گیا ہے۔ اس موازنے اور مقابلے کا مطلب کسی ادیب یا تخلیق کو ایک دوسرے سے برتر یا کم تر ثابت کرنا نہیں بلکہ صنف کی اسلوبی قدر و قیمت کو اُجاگر کرنا ہے۔ اس باب میں پہلا عنوان "تقابل کیا ہے" میں موازنے کی تعریف، ضرورت اور اہمیت کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔

باب چہارم کے بعد "ماحصل" میں ان چاروں ابواب کی تلخیص، نتائج اور تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ سب سے آخر میں کتابیات میں بنیادی مآخذ اور ثانوی مآخذ کا اندراج کیا گیا ہے۔

اس مقالے کی تکمیل کے دوران میں نے کامل ایمان داری سے ان ذرائع تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جو مقالے میں میرے معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ اپنے شہر اور دوسرے شہروں میں کئی لائبریریوں میں اپنے مطلوبہ مواد تک پہنچنے کی سعی کی۔ آفاق صدیقی کی معلومات حاصل کرنے کے لیے سٹڈی سنٹر کراچی رابطہ کیا۔اس مقالے کی تیاری میں میرے جِن احباب نے معاونت کی اُن میں سر فہرست ڈاکٹر ایوب ندیم سائنس کالج لاہوراورڈاکٹر ریاض قدیر منہاج یونیورسٹی لاہور ہیں۔ ان دونوں حضرات نے عنوان کی تلاش اور انتخاب کرنے میں میری بھرپور مدد کی۔ عنوان کسی بھی مقالے کے لیے ڈھانچے کا کام کرتا ہےجِس پر تحقیق کی عمارت استوار کی جاتی ہے۔اِنھوں نے مجھے فنی باریکیوں سے آگاہ کیا۔

میں اپنے مقالے کی نگران ڈاکٹر سامیہ احسن کے لیے سراپا سپاس ہوں کہ ان کی مہربانی، کرم نوازی اور رہنمائی کی بدولت خاکے کی تیاری سے لے کر مقالے کی تکمیل تک تمام مراحل بآسانی سے طے ہوتے چلے گئے۔ ان کے اخلاص، فراست، بہترین مشوروں، بروقت جانچ اور حوصلہ افزائی کے لیے میں تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

کتب اور تحقیقی مواد کی فراہمی کے لیے میں ادبیات گروپ کی ایڈمن عائشہ وڑائچ اور خزینہ ادب کے ظہیر عباس روشمانی کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری ہر طلب کردہ کتاب تک رسائی کو ممکن بنایا۔اِن تمام مراحل سے بطریقِ احسن گزرنے کے لیے انتہائی معاون ہستیوں میں میرے کلاس فیلو اور دوست منصور احمد، میرے ہر دل عزیز دوست لیکچرار امجد علی گورنمنٹ اسلامیہ کالج قصوراور میری شریکِ حیات شازیہ پروین نے بہت سی آسانیوں کے ساتھ پر خلوص مشاورت بہم پہنچائی۔ مقالے کی تکمیل میں حائل مشکلات کو دُور کرنے میں یقیناً بہت سے نام رہ گئے ہیں۔اُن کے لیے میرے دل سے یہی دعاہے کہ ربِ تعالیٰ اُن کی توفیقات میں اضافہ فرمائے(آمین)۔

تحقیق و تنقید کے اس کٹھن کام کی بجاآوری کبھی ممکن نہ ہو پاتی اگر ربِ کریم کی بے پایاں کرم نوازی اور شفقت کا سلسلہ مجھ پر دراز نہ ہوتا۔راقم کا یہ مقالہ نگران ڈاکٹر سامیہ احسن کی بھرپور راہنمائی اور احباب کی بے پایاں محبت، پُرخلوص مشاورت اور اپنے اپنے دائرہ کار میں تحریک کی بدولت مکمل ہو پایا۔

ان سب کے لیے ڈھیروں دُعائیں۔

ایم فل اسکالر

محمد ارشد

باب اوّل

اُردو میں خود نوشت سوانح عمری: فن اور روایت

فصل اول — فن سوانح نگاری: آغاز اور اقسام

فصل دوم — آپ بیتی کا مفہوم اور بنیادی مباحث

فصل سوم — خود نوشت سوانح عمری کی عالمی روایت

I. عربی ادب میں آپ بیتی کی مختصر روایت
II. فارسی ادب میں آپ بیتی کی مختصر روایت
III. انگریزی ادب میں آپ بیتی کی مختصر روایت
IV. اردو ادب میں آپ بیتی کی مختصر روایت

فصل اول

فن سوانح نگاری: آغاز اور اقسام

سوانح نگاری ادب کی اہم ترین صنف ہے۔ اس صنف میں کسی بھی شخصیت کے حالات زندگی، خاندانی پس منظر، طرز نگارش اور ادبی سفر اور سرگرمیوں کے بارے میں پتہ چلایا جاتا ہے۔ اس کے مطالعے سے صاحب سوانح کے احساسات، خیالات، عادات اور نظریات سے آشنائی کے ساتھ ساتھ دیگر بنیادی باتوں کا بھی پتہ چلایا جاسکتا ہے۔

- مذکورہ شخصیت کا عہد کیسا تھا؟
- اُس دور میں اُس خطے کی لسانی، تہذیبی، ادبی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی فضا کیسی تھی؟ ان باتوں کا پتہ سوانح سے ہی معلوم کیا جاسکتا ہے۔

"خود نوشت سوانح حیات" اور "سوانح عمری" دونوں ہی سے قاری کسی شخص کی زندگی کے حالات کے متعلق ضروری اور اہم معلومات حاصل کر سکتا ہے لیکن دونوں کے درمیان ایک واضح فرق ہے۔

- خود نوشت سوانح حیات میں فرد نہ صرف اپنے بارے میں خود لکھتا ہے بلکہ اپنے زاویہ نگاہ سے لکھتا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں یہ سوچ کارفرما رکھتا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے اپنا کیا تصور پیش کرنا چاہتا ہے۔
- سوانح نگار کا مطمع نظر یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو لوگ کیا سمجھتے ہیں اور دراصل وہ کیا ہے؟

سوانح حیات کسی مخصوص فرد کی زندگی اور کردار کے مسلسل بیان کا ہنرمندانہ اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں اپنی طرف سے اضافہ کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ انور (ا) اس بارے میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں:-

> "سوانح عمری تاریخ کی ایک شاخ ہوتی ہے۔ اس کا مقصد جہاں تک ہوسکے دیانت داری کے ساتھ کسی فرد کی زندگی کا بیان ہوتا ہے۔ سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ مورخ اور مصوّر دونوں حیثیتوں سے کام کرے۔"

بقول اُن کے یہ بات مسلّم ہے کہ دوسروں کی سوانح حیات پہلے لکھی گئیں اور آپ بیتی لکھنے کے رجحان نے بعد میں جنم لیا۔ پہلی صنف میں بوجہ قدامت بڑا سرمایہ ہے۔ چونکہ دوسری صنف بعد کی چیز ہے اس لیے اس کا ذخیرہ کم ہے۔ دونوں کو اکثر ایک ہی معانی میں لے لیا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں میں مماثلت کم اور مغائرت زیادہ ہے۔

سوانح عمری میں پہلے سے لکھے گئے مواد سے استفادہ کیا جاتا ہے جبکہ خودنوشت میں ایسی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ سوانح عمری میں اصل دستاویزات، خطوط، روزنامچے، ڈائری اور سرکاری ریکارڈ کا سہارا لیا جاتا ہے جبکہ آپ بیتی میں صحت واقعات کے خیال سے ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ سوانح عمری میں معاصرین کا تذکرہ معاون ثابت ہوتا ہے جبکہ خودنوشت میں ایسے کسی التزام کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ آپ بیتی لکھنے والا اس صنف میں خود اپنی دنیا آباد کرتا ہے۔

سوانح عمری میں مصنف اپنے "ہیرو" کے بارے میں ذاتی واقفیت رکھتا ہے تو اُسے اپنی یادداشت اور ذاتی معلومات سے کام لینا ہوتا ہے جبکہ خودنوشت سوانح حیات میں مصنف اپنی ذات کے سمندر کا خود غوطہ خور ہوتا ہے اس لیے وہ اپنی یادداشت کے بَل بوتے پر آپ بیتی کی پوری عمارت تیار کرلیتا ہے۔ سوانح حیات کسی کی ہو یا مصنف کی اپنی، اس میں جدت کا امکان رہتا ہے۔ انور (۲) لکھتی ہیں:۔

> "Dowden جس نے Shelly کی سوانح عمریاں لکھی تھیں جن کی اہمیت بعد میں کم ہوگئی تھی کیونکہ بعد میں اس سے بہت مختلف باتیں منظرعام پر آئیں۔ اس لیے بیان کیا جاتا ہے کہ عظیم ترین شخصیتوں کی زندگی کے حالات پر وقتاً فوقتاً ریویو کرنے کی اور ان کو نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ جبکہ خودنوشت سوانح حیات ایک طرح سے پتھر کی لکیر ہے۔"

بہت سے مشاہیر اور فن کاروں نے دوسروں کی اور اپنی سوانح عُمریاں لکھ کر اس فن کو وقار بخشا ہے۔ زمانہ قدیم سے سوانح لکھنے کا فن چلا آرہا ہے۔ مغرب میں قدما اور عظّام کے حالات زندگی جمع کرنے کا آغاز سب سے پہلے یہودیوں کے ہاں ملتا ہے۔ یہودیوں کے بعد اہل یونان نے اس فن پر توجہ دی اور سب سے پہلے سوانح نگار جوزف فلیوس نے یہودیوں کی تاریخ قلم بند کی۔ اُنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی لکھ کر اس فن کی داغ بیل ڈالی، لیکن مشرق میں اس فن کی روایت کا آغاز اس سے بہت پہلے ہو گیا تھا۔ فلیوس سے قریب ایک ہزار سال قبل بالمیک نے رام چندر جی کے سوانحی حالات "رامائن" میں بیان کیے۔ اس طرح "رامائن" کو دنیا کی پہلی قدیم ترین سوانح عُمری کہا جاسکتا ہے۔

خود نوشت سوانحِ حیات کی اہمیت:

انسان کے اندر تجسّس کا مادہ کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اسے اپنے گرد و پیش کی اشیاء اور افراد کو جاننے اور سمجھنے کا اشتیاق ہمیشہ سے رہا ہے۔ جستجو اس کے خمیر میں ہے۔ کائنات کے اسرار و رموز اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے بارے میں جاننے کی خواہش بیک وقت اس کی عظمت کی ضامن بھی ہے اور جبلی کمزوری بھی۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس نے زمین کی وسعتیں اور سمندر کی گہرائیاں تک سر کی ہیں۔ اپنی رفعت پرواز میں اس انسان نے اپنی عقل اور شعور کی بدولت آسمان کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ جستجو کا یہ جذبہ ہی انسان کو کاروان حیات میں آگے بڑھنے پر اُکسا رہا ہے۔ دنیا کو سمجھنے اور جاننے کے لیے انسانی علم کے دو مآخذ ہیں۔ ایک تو وہ جو ہم اپنے خارجی مشاہدات سے حاصل کرتے ہیں اور دوسرا اپنی ذات کا تجزیہ ہے۔ یہ انسانی ذات ہی ہے جہاں ہمارے علاوہ کوئی نہ رسائی پا سکتا ہے نہ جھانک پاتا ہے۔ معرفت ذات خارجی علم کی آگاہی سے زیادہ دشوار کار ہے۔ قدماء، ادباء اور مشاہیر نے اپنی زندگی کے تلخ و شیریں واقعات، یاد داشتوں اور کارہائے نمایاں کو ضبط تحریر میں لا کر سوانح نگاری کے فن کو عروج پر پہنچایا ہے۔

انسان کو ہمیشہ سے اپنے بارے میں جاننے کا ذوق و شوق رہا ہے۔ اس کی فطرت تجسس سے بھرپور ہے اور وہ ان سوالات کو ابھارتی ہے کہ اس کے ذہن میں ہے، میں کون ہوں، کیا ہوں، کہاں سے آیا ہوں، اس دنیا میں میرے آنے کا مقصد کیا ہے؟ جیسے لاتعداد سوالات پیدا کرتی رہتی ہے۔ ذہن میں کلبلاتے ان سوالات کی بدولت حضرت انسان نے کبھی فلسفے کی گُتھیاں سُلجھائیں اور کبھی نفسیاتی گرہیں کھولنے کی کوشش کی۔ کبھی مذہب میں پناہ تلاش کی تو کبھی سائنس اور مابعد الطبیعاتی علوم میں غوطہ زن ہوا۔ مجاز سے سچائی کا یہ سفر روزازل سے تاحال جاری و ساری ہے۔ ہر عہد اپنے جوابات کو ڈُھونڈ لا کر نئے انکشافات اور امکانات پیدا کرتا ہے۔

انسانی حیات کے اس لامتناہی سفر میں، دوسرے عالمی علوم کے ساتھ ساتھ، ادب بھی حیات اور کائنات کی مقصدیت، حقیقت، اصلیت اور مفہومیت تلاش کرنے کا ذریعہ رہا ہے۔ اصناف ادب میں سوانح نگاری کسی بھی شخصیت کی سچی اور حقیقی تصور پیش کرتی ہے۔ انور (۳) وضاحت کرتی ہیں کہ اگر ذات کے اظہار کو فن سمجھا جائے تو ادب کی اصناف میں خود نوشت سوانح حیات فن کی ایک خالص شکل ہے جس میں آپ بیتی لکھنے والے کی پیشانی کی

تیوریاں اور اس کے ہونٹوں کے نیچے کا تبسم، سوچنے و سمجھنے کا انداز اور دل و جان کے دھڑکنے کی آواز بھی سُنائی دیتی ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ خود نوشت سوانح حیات میں خود کے حالات بیان کرنے کے علاوہ دوسروں کے حالات زندگی بھی قلم بند کیے جاتے ہیں۔ وجود ذات سے ہٹ کر آپ بیتی اپنے عہد کی تہذیب اور تاریخ کی بھی عکاس ہوتی ہے۔ یہ نہ صرف فرد کی ظاہری صورت حال بلکہ دلی کیفیات کا احوال بھی پیش کرتی ہے۔ وہ اپنے بچپن سے لے کر تادم تحریر تک کے حالات و واقعات کو خود بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خود نوشت میں سچائی کے ساتھ واقعات کا بیان کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے حالات و واقعات میں ردبدل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اپنے فن کے ساتھ انصاف نہیں کرتا ہے۔ آپ بیتی کسی شخص کی حیات کے جُملہ محاسن، تلخ و شریں حقائق اور جسم و رُوح کے سارے مناظر کو سامنے لے کر آتی ہے۔ یہی وہ خاصیت ہے جو آپ بیتی کو ادب عالیہ میں شمار کرتی ہے۔

سوانحی ادب کی عام طور پر تین صورتیں رائج ہیں:

ا۔ خاکہ نگاری

۲۔ سوانح حیات

۳۔ آپ بیتی یا خودنوشت

(ا): خاکہ نگاری

خاکے کو انگریزی زبان میں Sketch کہا جاتا ہے جس کے معنی ڈھانچا، نقشہ یا ہاتھ سے بنائی گئی خام تصویر کے ہیں۔ ادبی معنوں میں "خاکہ" وہ مختصر عبارت ہوتی ہے جس میں کسی بھی شخصیت یا فرد کی زندگی کے حالات میں سے چند پہلوؤں کو لے کر مختصر کر کے بیان کر دیا جاتا ہے۔ ورک (۴) اس خاکے کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

> "وہ تحریر جس میں نہایت مختصر طور پر اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ، عادات و اطوار اور کردار کو سیدھے سادے انداز میں روانی اور جولانی کے ساتھ بیان کر دی جائے"

ناقدین نے خاکہ نگاری کو شخصیت کی کھوج کا کام قرار دیا ہے۔ خاکہ نگاری میں شخص کے ظاہری واقعات، کارکردگی اور حالات زندگی بیان کیے جاتے ہیں، اس لیے باطن شناسی کے لیے نفسیات سے آگاہی اور فن مردم شناسی کا پارکھ ہونا ضروری ہے۔ دوسروں کی شخصیت پر خاکے لکھنے کے ساتھ اُردو میں خود نوشت خاکے کی روایت بھی مستحکم ہے۔

(۲) : سوانح حیات

سوانح حیات میں خاکے کی طرح کسی ایک جُزوی پہلو کی بجائے تاریخ پیدائش سے وفات یا تا حال کے حالات وواقعات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ شخصیت نگاری دراصل ایک سائنس ہے۔ اس کے وسیلے سے سوانح نگار نہ صرف اپنے ہیرو کی حیات و خدمات کو بیان کرتا ہے بلکہ اس کی شخصیت کو پروان چڑھانے والے عناصر، دُور بینی اور نفسیات کے بدولت اس کی شخصیت کے پوشیدہ بہت سے گوشے بھی طشت اَز بام کرتا ہے۔ ہاشمی(۵) اس حوالے سے سوانح نگار کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی انسان کی ٹھیک منظر کشی کے لیے سوانح نگار کو بیک وقت مُبصر، ماہر نفسیات، محقق، مورخ، اور ادیب بننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انصاری(٦) لکھتے ہیں:-

> "سوانح نگاری ایک ذمہ دار صنف ادب ہے۔ جن شخصیتوں کے سوانح ماڈل یا نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے کے سامنے پیش کیے جائیں اُن میں واقعی کوئی بات ایسی بھی ہونی چاہیے کہ پڑھنے والے کو احساس ہو کہ اس شخصیت کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ یہی شخصیتیں ہمارے سماج میں ہیرو بن کے اُبھرتی ہیں۔ اُن کا میدان عمل خواہ سیاسی ہو، روحانی یا ادبی۔ یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ جن شخصیات کے سوانح حیات پیش کیے جائیں۔ اُن کی صرف مدح سرائی ہی نہ کی جائے۔ سوانح نگاری کوئی قصیدہ نگاری نہیں ہے"

اگر دیکھا جائے تو تاریخ دراصل نامور شخصیات کی سوانح ہی ہوتی ہے لیکن ادبی و علمی اور فنی و فکری لحاظ سے ان میں فرق پایا جاتا ہے۔ ناقدین کے مطابق ایک اعلیٰ سوانح حیات کی ادبیت، حسُن ترتیب اور زبان و بیان کی خوب صورتی اسے ادب میں شامل کرتی ہے۔ عبدالقیوم (۷) لکھتے ہیں کہ سوانح تاریخ اور افسانہ نہیں ہے اور بلکہ یہ تاریخ کی ابدی سچائی اور افسانے میں بیان غیر حقیقی زندگی کے درمیان کی چیز ہے۔

بقول ان کے سوانح میں ہیرو کی ذہنی کیفیت تک پہنچ کر اُسے ٹٹولنا اور اُس کی شخصیت کے اتار چڑھاؤ کو گرفت میں لے لینا ایک اچھے سوانح نگار کا بنیادی وصف ہونا چاہیے۔ ہیرو کی سوانح حیات میں موجود الجھنوں کو دیانتداری اور سب سے زیادہ بے باکی سے بیان کرنا لازمی امر ہونا چاہیے۔ اس کی یہی فنی ترتیب اور تنظیم سوانح کی اساس ہے۔

(۳) : ۔ آپ بیتی یا خود نوشت

آپ بیتی یا خود نوشت سوانح حیات میں مصنف خود کے بارے میں معلومات پیش کرتا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف اپنی ذات کا عکس اپنی تحریر کے ذریعے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ انسان اس کائنات کے لاتعداد تجربات اور بے شمار واقعات سے دوچار ہوا ہے۔ یہ گوناگوں تجربات اور متنوع مشاہدات فرد کی زندگی پر لاتعداد اور دیرپا نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ہر انسان یہ خواہش کرتا ہے کہ وہ اپنی حیات کی ان یادگار ساعتوں کو امر کردے اور اپنے تجربات کی دوسروں کے ساتھ شراکت کرے۔ دوسرے لوگوں کو اپنے تجربات میں شریک کرنے کی آرزو انسان کو آپ بیتی کی طرف راغب کرتی ہے۔ آپ بیتی نگار اپنے ادبی سفر، خاندانی حالات، خاندانی پس منظر اور دیگر سرگرمیوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو حقائق کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح ہم آپ بیتی کو پڑھ کر اس کے خیالات، احساسات اور نظریات کو جانتے ہیں کہ اس نے کس طرح کی زندگی بسر کی اور اس کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ بیتی کے ذریعے ہم اس کے دور کے بارے میں بھی واضح معلومات حاصل کرتے ہیں۔ لوگوں کا رہن سہن اور طور طریقے کیا تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک آپ بیتی اپنے عہد کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

فصل دوم

آپ بیتی کا مفہوم اور بنیادی مباحث

ایک ادیب خود کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے دراصل اپنے گرد و پیش کے جائزہ سے حاصل شدہ معلومات کو ہی سپرد قلم کرتا ہے۔ ادیب معاشرتی کردار ہے، وہ اسی سماج کا حِصہ ہے جِس میں دوسرے تمام جان دار موجود ہوتے ہیں۔ انسان نے جب اپنی خارجی دنیا کو اچھی طرح جان لیا تو اس نے اپنے داخل سے رجوع کرنا سیکھا۔ اپنے خارج، اپنے داخل، اپنے تخیّل اور اپنی قوتِ مشاہدہ کی مدد سے اس نے انکشافِ ذات کے لیے آپ بیتی کا سہارا لیا۔ اعترافِ ذات اور انکشافِ ذات کا حوصلہ کسی کسی میں ہوتا ہے۔

ماہرین اور ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ سو فیصد سچائی پر مبنی آپ بیتی لکھنا ناممکنات میں سے ہے۔ اپنی ذات کے انکشافات میں سچائی اور بر ملا گوئی ایسی رکاوٹیں ہیں جن کو پار کرنا ہر آپ بیتی لکھنے والے کے لیے آسان نہیں۔

"خود نوشت" فارسی زبان کے دو الفاظ کا مرکب ہے جِس کا مفہوم کسی شخص کا اپنے متعلق لکھے ہوئے حالات و واقعات ہیں۔ اُردو میں "خود نوشت" اور "آپ بیتی" ہم معنی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

آپ بیتی کو انگریزی زبان میں Autobiography کہتے ہیں۔ اس لفظ میں "Auto" لاحقہ ہے جِس کے معنی "خود" کے ہیں۔ Bio سے مراد انسانی حیات اور Graphy سے مراد "بیان کرنا یا تحریر کرنا" کے ہیں۔ اس ضمن میں انور (۸) اپنی تصنیف "اُردو میں خود نوشت" میں آکسفورڈ ڈکشنری کا حوالہ دیتے ہوئے قلم طراز ہیں:

“The description of one’s life written by himself”

یعنی آپ بیتی اپنی ذاتی زندگی کو خود تحریر کرنے کا نام ہے۔ ماہرین نے آپ بیتی کی اب تک اس صنف کی جو تعریفیں کرنے کی کوشش کی ہے ان سے حقیقی معنوں میں یہ واضح نہیں ہو سکا کہ آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری کی صنف محض شخصیت کے اظہار کا نام ہے یا خود شناسی کا یا دونوں کے امتزاج کا نام ہے۔

مغربی ناقدین میں ابراہم (۹) کہتے ہیں:-

"Autobiography is a biography written by the
Subject about himself or herself"

" (خود نوشت ایک سوانح عمری ہے جسے ایک فرد نے اپنے بارے لکھا ہو) "

فرانسیسی سوانح نگار اور مؤرخ فلپ لیجون (۱۰) آپ بیتی کے ضمن میں رقم طراز ہیں:-

"Retrospective prose narrative written by a real person covering his own existence, where the focus is his individual life,in particular the story of his personality".

" (ایک حقیقی شخص کے بارے میں لکھی گئی سابقہ نثری داستان جو خاص طور پر
طور پر اس کی انفرادی زندگی مرکزِ توجہ رہتی ہے) "

آپ بیتی لکھنے والا اپنی زندگی کے منتشر عناصر کو یکجا کر کے انھیں ایک جامع صورت میں منظم کر کے اپنی تاریخ لکھتا ہے۔ ناقدین اُردو نے خود نوشت کو انکشافِ ذات سے زیادہ کچھ نہیں لکھا۔ جین (۱۱) لکھتے ہیں کہ آپ بیتی سوانح کی وہ صنف ہے جِس میں کوئی شخص خود اپنی سوانح تحریر کرتا ہے

مندرجہ بالا تعریف سے واضح نہیں ہوتا کہ خود نوشت اظہارِ شخصیت ہے یا ذریعہ خود شناسی؟ اس لیے ماہرین کی رائے جاننا ہوگی تاکہ اس صنف کے تقاضوں اور محرکات کے بارے میں صراحت سے وضاحت ہو سکے۔ علوی (۱۲) لکھتے ہیں کہ خود نوشت سوانح حیات، وہ ادبی صنف ہے جو کسی ایک فردِ کی زندگی کے اہم حالات و واقعات پر مشتمل ہوتی ہے اور اسی کے قلم کی ممنون، شکر گزار اور احسان مند ہوتی ہے۔ جِس کے مظہر میں اس فرد کی خارجی اور داخلی زندگی کا عکس براہِ راست جلوہ گر ہوتا ہے اور اس کا دور بھی نظر آتا ہے۔

بانو (۱۳) کی رائے:

"آپ بیتی نگار وقت کی دبیز تہوں کو ہٹا کر حافظے کے نہاں خانوں میں دفن یادوں کو تصوّر کی کدال سے کھود کھود کر نکالتا ہے اور تخیل کی کِرنوں سے اِنھیں چمکاتا ہے اس عمل میں اسے اپنی زندگی کے مختلف ادوار کو دوبارہ جینا پڑتا ہے۔"

فریدی (۱۴) کی رائے ہے کہ خود نوشت کسی شخص کی زندگی کے ایک بڑے حِصے کا، خود اسی کے قلم سے بلا ارادہ اور حتی الامکان مرتب بیان ہوتا ہے۔ جس میں عام طور سے مصنف کے حالات، قلبی واردات و تاثرات، ذاتی کامیابیوں اور ناکامیوں کے علاوہ اس کے خاندان، معاشرہ اور احباب وغیرہ کا بھی حسبِ ضرورت ذکر ہوتا ہے۔ چونکہ یہ ساری باتیں عُمر کے آخری حِصہ میں قلم بند کی جاتی ہیں اس لیے آپ بیتی میں مصنف کی زندگی کے بیش تر اہم اور قابلِ ذکر احوال سمٹ آتے ہیں۔ مصنف اس آئینے میں اپنے ماضی کو خود دیکھتا ہے اور دُوسروں کو دکھاتا ہے۔ اس کے اس عمل کے پیچھے کئی طرح کے جذبات کار فرما ہوتے ہیں" آپ بیتی "زندگی کے عہد بہ عہد مطالعہ کا نام ہے۔ ہر انسانی

اپنے نکتہ نظر کے مطابق ان اَدوار میں اپنی زندگی کو دیکھتا ہے۔ یہ نکتہ نظر وجدانی، روحانی، نفسیاتی، عرفانی، تجرباتی، مشاہداتی، مذہبی اور فلسفے سے مربوط ہو سکتا ہے۔ خود نوشت کے کچھ ناقدین اسے محض ذات کا اظہار نہیں بلکہ خود شناسی کا ذریعہ بھی کہا ہے۔

ہاشمی (۱۵) لکھتے ہیں کہ آپ بیتی صرف فرد کے حالات اورواقعات کی داستان نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات ادیب کے داخلی احساسات، کیفیات، مشاہدات، شخصی اور عملی تجربات، زندگی کے جذباتی پہلوؤں اور مکمل زندگی کے متعلق اس کے زاویہ نگاہ کی عکاسی کرتی ہے۔ اس طرح ایک قاری کو ایک ادیب کے بارے میں بہت سے حقائق جاننے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

نیّر (۱۶)

> "آدمی کا نجی، داخلی وجود ایک ٹھوس، جامد وجود نہیں۔ یہ ایک ایسی سیال شے ہے جو اظہار کے دوران میں تشکیل پاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ بیتی نگار اپنے باطن کی سیاحت کرتا ہے۔ اندر کی نیم روشن دنیا میں سفر کرتا ہے اور بعض ایسی باتوں سے آگاہ ہوتا ہے جو خود اس کے لیے باعثِ حیرت ہو سکتی ہیں۔"

جمال (۱۷)

> "خود نوشت لکھتے وقت آدمی کو خود نگری و خود پوشی و خود نمائی، خود جوئی و خود احتسابی اور اخذ و ترک کی بعض بڑی کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

طفیل (۱۸) لکھتے ہیں کہ آپ بیتی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات و نظریات کی مربوط داستان ہوتی ہے جس میں اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے ایام قلم بند ہوتے ہیں۔ جس سے اس کے بہت سے رازوں کے پردے بے نقاب ہو جائیں اور ہم ان کو اس کی خارجی زندگی کی روشنی میں جانچ سکیں۔ طفیل نے جب لکھا کہ خود نوشت کو پڑھ کر کسی شخصیت کے رازوں کے پردے اُٹھ جائیں تو اس کا مفہوم یہی ہے کہ آپ بیتی کو خارجی زندگی میں پَرکھا جا سکے اور آپ بیتی نگار اپنی خود نوشت میں خود شناسی کے تمام سفر کا احوال بیان کرے۔ آپ بیتی صرف شخصیت کے اظہار کا نام نہیں بلکہ حیاتِ انسانی کے بارے میں خاص نقطہ نظر کی ترجمانی ہے۔ آپ بیتی باطن کی سیاحت ہے جس کے ذریعے انسان حیرت انگیز حقائق سے آشنا ہوتا ہے۔

ندوی (۱۹) آپ بیتی ہی کے ضمن میں رقم طراز ہیں کہ اگر یہ سوال پوچھا جائے کہ ادب اور انشائیہ اور تاریخ اور تذکرہ کی اصناف میں سب سے زیادہ دل چسپ، دل آویز، خوش گوار اور شوق انگیز صنف کون سی ہے تو شاید اکثر صاحب علم کا جواب یہی ہو گا کہ ایک اچھے لکھاری اور ادیب کے قلم سے تحریر شدہ " آپ بیتی"۔

آپ بیتی کی تعریف کے ضمن میں تمام آراء کو جانچنے سے پتہ چلتا ہے کہ کسی فرد کی زندگی کی کہانی چاہے خود بیان کی جائے یا ضبطِ تحریر میں لائی جائے دونوں صورتوں میں سچائی کے عناصر کو پیش نظر رکھنا ضروری امر ہے۔ یہاں آپ بیتی اور خود نوشت مابین وضاحت بھی ضروری ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں ایک ہی صنف کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ لفظی اعتبار سے "آپ بیتی" خود پر گزرے ہوئے واقعات کی داستان حیات ہوتی ہے۔ یہ بیان زبانی یا تحریری دونوں طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ خود نوشت اپنے قلم سے تحریر شدہ فن پارہ خیال ہوتا ہے۔ وسیع معنوں میں کسی فرد کی قلمی تحریریں جنھوں نے اُردو میں ذاتی محاسن و معائب کا احاطہ کیا ہو، خود نوشت کہلاتی ہے، انگریزی میں Autobiography کا نام دیا جاتا ہے۔ انگریزی میں خود نوشت سوانح عمری سے ہی ادا ہو گا۔ "آپ بیتی" خود نوشت یا سوانح عمری کے لیے جامع اور مختصر اصطلاح ہے۔

سوانحی ادب میں "آپ بیتی" اس لحاظ سے ممتاز مقام کی حامل ہے کہ کسی فرد کی ذاتی زندگی کو خود اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ کسی شخصیت کے ظاہری حالات تو کوئی بھی بتا سکتا ہے لیکن اندرونی کیفیات، نفسیاتی ہیجانات اور باطنی و قلبی واردات کو دوسرا کوئی بھی شخص بیان نہیں کر سکتا۔ اس طرح آپ بیتی کے ذریعے کسی شخصیت کی زندگی کی سچی اور حقیقی تصویریں منظر عام پر آنے کے زیادہ امکانات ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ ایک بیان ہے کہ کوئی سوانح نگار اپنی کمزوریوں، خامیوں اور شخصیت کی خامیوں کو بحالت مجبوری بیان نہ کر سکے۔ اگر ایسا ہو تو فنی لحاظ سے ایسی کاوش ناقص ہو گی کیونکہ سچائی اور راست بازی سوانح نگاری کی شرط اوّلین ہے۔ ضروری ہے کہ نرگیست کے خول سے نکل کر اور ذات سے بلند ہو کر آپ بیتی تحریر کی جائے۔ ایک اور امر کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ تحریر صرف خوبیوں، کامیابیوں اور کامرانیوں کے تذکرے سے ہی مزّین نہ ہو بلکہ اس میں خامیوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کا بھی اعتراف ہو۔ اپنی خامیوں کا بیان کوئی آسان کام نہیں۔ اسی وجہ سے ناقدین نے خود نوشت سوانح عمری کو تلوار کے وار جیسا خطرناک کام قرار دیا ہے۔ عبد اللہ (۲۰) آپ بیتی قلم بند کرنے کے عمل کو امرِ محال کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر کوئی فرد مکمل آپ بیتی تحریر کا اعلان کرتا ہے تو وہ بہت بڑی بات کا دعویٰ کرتا ہے جو اس کی طاقت سے دور نظر آتا ہے۔ عبد اللہ (۲۱) آپ بیتی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آپ بیتی بڑی گھٹیا صنف ہے اس میں ملّمع سازی زیادہ ہوتی ہے۔ حقیقت کو عیاں کرنے کی بجائے پوشیدہ اور مخفی رکھا جاتا ہے اور لوگوں کو دھوکا دیا جاتا ہے کہ میں بہت بلند پایہ کا راست باز اور صاف گو ہوں۔

اپنے ایک مضمون "اردو میں آپ بیتی" میں عبداللہ (۲۲) کہتے ہیں آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری کی صنف دوسروں کی تحریر شدہ سوانح عمریوں کے مقابلے میں بہت ناکام، نامراد اور ناپختہ چیز ہوتی ہے اس کی ناکامی کی دو وجوہات ہیں جس میں ایک دوسروں کے سامنے اپنی اصلیت بیان کرنے کا خوف اور دوسری خود سے بہت زیادہ محبت ہے۔

مندرجہ بالا خدشات اور تحفظات کے باوجود مقامی اور عالمی ادب میں آپ بیتیوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور دنیا کی ہر زبان میں تادمِ تحریر یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ سوانح نگار لکھتے ہوئے اپنی یا کسی دوسرے فرد کی زندگی کے صرف وہی پہلو سامنے لائے جو اُس کے نزدیک پسندیدہ اور لائق تحسین ہوں اور غلطیوں، برائیوں، کوتاہیوں خامیوں پر اپنے زورِ بیان اور اسلوب سے ایسی رنگ آمیزی کرے کہ وہ بُری لگنے کی بجائے قابلِ معافی بشری کمزوریاں محسوس ہونے لگیں۔ اگر کوئی سوانح نگار اس کا مرتکب ہوتا ہے تو گویا اس کی ذات میں جھوٹ بولنے، غلط کو درست، جھوٹ کو سچ اور باطل کو حق ثابت کرنے کا مادہ موجود ہوتا ہے۔

اگر کسی مصنف کے اندر یہ وصف موجود ہے تو پھر اس کی ہر تحریر میں بہت زیادہ جھوٹ کا عنصر موجود ہوگا اور اس طرح وہ نا قابلِ اعتبار ٹھہرے گا۔ آپ بیتی کو صرف اس لیے ہی نا قابلِ اعتبار سمجھا جائے کہ اس میں مصنف اصل حقائق بیان کرنے کی بجائے حقائق کو چھپائے گا۔ آپ بیتی کو مکمل طور پر مسترد کر دینا درست عمل نہیں ہے کیونکہ تحقیق کے لیے کسی فرد کی ذاتی ڈائریوں یا خطوط اور تحریروں کو اس کے نجی حالات کو جاننے کے لیے بنیادی ماخذ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ انسان خود کے بارے میں جو لکھتا ہے وہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد اور حقیقت کے قریب تر ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں طویل دَورانیے کی متقاضی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی چیز بر خلافِ حقیقت ہو گی بھی تو وہ بے نقاب ہو جائے گی۔ تحقیق سے کام لے کر آپ بیتی میں موجود مغائر امور کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے فرد کی زندگی اور عہد سے متعلق دیگر کُتب، ذرائع داخلی اور خارجی شواہد کی چھان بین سے بھی کئی حقائق سامنے لائے جاسکتے ہیں۔ اس لیے آپ بہ یک جُنبشِ قلم اس صنف کو ناقص، ناکام اور نارسا قرار نہیں دے سکتے۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے محقق مہر (۲۳) لکھتے ہیں:-

> "آپ بیتی پر ہمہ گیر بے اعتمادی کا خطِ بطلان کھینچنا مناسب نہیں۔ دنیا کے عام ذخیرہ نگارش کی طرح آپ بیتی بھی نقد و نظر سے باہر نہیں۔ ہمارے لیے غور و فکر اور چھان بین کے ذریعے سے بہ ہمہ وجود صحیح واقعات اخذ کر لینا مشکل نہیں بلکہ نفسِ معلومات صحیحہ کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو آپ بیتی کو ہر دَور کے ذخیرہ تاریخی اور انبارِ عبرت پر ترجیح حاصل ہے اور اس کے اعتراف میں تامّل کیوں نہ کیا جائے۔"

آدمی سے انسان اور انسان سے اشرف المخلوقات کے مقام تک پہنچنا ہر ایک کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ آبادی کے اس جنگل میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صرف دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ ان کے سامنے ملک، قوم، وطن، دین و ایمان یا اخلاقی اقدار ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے کارہائے نمایاں سے اس عالم کو خوب صورت بنانے کے لیے ہمہ وقت بر سرِ پیکار رہتے ہیں۔ انسان کو جس مقصد کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، دوسروں کے لیے اپنی زندگی وقف کر کے انھیں آسانیاں فراہم کرنے کی سعی کرنا یقیناً کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں۔ الطاف حسین حالیؔ نے کیا خوب کہا ہے کہ

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا

مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

آپ بیتی وہی زندہ و جاوید رہ سکتی ہے جو کسی فرد کی زندگی کے درجہ بدرجہ مراحل، عام فرد سے انفرادیت اور قابل تقلید بننے کی کہانی کو بیان کر سکے جس میں جسم اور روح کے زینہ بزینہ مراحل کا بیان فنی کمال، مہارت، تیز دستی، کاریگری، مہارت فن اور پھرتی و چالاکی سے کیا گیا ہو۔ ایسی آپ بیتی بقول ندوی (۲۴) :-

"نارسا کہلائے گی اور نہ ہی ناقص۔"

ایک اچھی آپ بیتی، فرد کی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان ہونے کے ساتھ ایک عہد کا نقشہ بھی پیش کرتی ہے۔ اس اعتبار سے آپ بیتی، جگ بیتی بن کر اپنے دَور کے حالات و واقعات، سماجی افکار، علوم و فنون، پیشے، اجتماعی روّیے اور اس دَور میں کسی قوم کے تہذیبی سفر کا احوال بہ زبانِ تحریر بیان کرتی ہے۔ آپ بیتی فرد کی ذات سے وابستہ عوامل کا موتیوں کی طرح ایک لڑی میں اختصار کے ساتھ پرونا ناگزیر ہے۔ آپ بیتی تاریخی حقائق کو ٹھیک کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف علوم کے لیے مدد و معاون واقع ہوتی ہے۔ آپ بیتی کی خوب صورتی اس کے بے تکلف انداز اور اتفاقی طور پر لکھنے میں پوشیدہ ہے۔ آپ بیتی کا مصنف اپنی اندرونی صورتحال سے پوری طرح سے آگاہی رکھتا ہے۔

خودنوشت میں زبان و بیان سادہ، سلیس، دلچسپی سے معمور اور قاری کے مزاج سلیم کے عین مطابق ہونا فنی مطالبہ ہے۔ اس میں حقیقت پسندی، سچائی، راست گوئی اور غیر جانب داری کا عناصر زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ غلط بیانی، حاشیہ آرائی، مبالغہ آمیزی، تکلف و تصّنع اور رنگ آمیزی آپ بیتی تو کیا کسی بھی تحریر کو فنی اور ادبی مقام سے گرانے کا سبب فراہم کرتے ہیں۔ آپ بیتی کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ ہر مصنف کا انداز بیان الگ اور خصوصیات منفرد ہیں اور انداز بیان ہی انھیں ایک دوسرے سے منفرد کرتا ہے۔ آپ بیتی میں وسعت اور تنوّع کا بھی اپنا مقام ہے۔ آپ بیتی میں مصنف تو موجود ہوتا ہی ہے لیکن دیگر شخصیات کے ساتھ ساتھ اس کے تعلقات، کام

کاج اور ذمہ داریوں کی نوعیت آپ بیتی کو معنی اور مقصد سے بھرپور بناتی ہے۔ یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ مصنف نے حالات وواقعات کے بیان میں کس جگہ، کتنا جھوٹ سے کام لیاہے اور کتنا سچ سے۔ کہاں مبالغہ آرائی کی ہے، کہاں توازن بر قرار رکھاہے۔ سب سے خاص بات اسلوب کی شگفتگی، تازگی اور سحر انگیزی ہے۔ پروازی (۲۵) فنی اعتبار سے آپ بیتی کے ضمن میں قلم طراز ہیں:-

"خود نوشت کے فن میں کم از کم تین عناصر اہم ہیں۔ لکھنے والی کی یادداشت، لکھنے والے کا اسلوب اور لکھنے والے کے ارد گرد کا حلقہء رجال واحباب۔"

ایک خاص بات یہ ہے کہ اختصار اور پوشیدہ ذات کے نتیجے میں حقائق کو صیغہ راز میں بھی رکھا جاسکتا ہے۔ اکثر لوگ شعوری طور پر ایسی بات چھپالیتے ہیں جو ان کی شخصیت کے کسی کمزور پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ آپ بیتی لکھنے والے کی شعوری کوشش یہی ہو گی کہ اپنی داستان حیات کی صرف وہی جہتیں منظر عام پر لائے جو اس کے نزدیک شایان و شان ہوں۔ خود نوشت سوانح نگاری میں صداقت سب سے بڑا وصف ہے جو شخصی تاریخ لکھنے کے لیے اوّلین چیز ہے۔ سچائی ہی وہ رُوح ہے جو انسانی زندگی کو دوبارہ مرتب کر کے اور متحرک و جاندار بنا کر سامنے لے کے آتی ہے۔

آپ بیتی لکھنے والے کے لیے لازم ہے کہ اپنی زندگی کے تمام محاسن و معائب دکھائے جو ایک فرد کی تصویر کشی کے لیے ضروری ہیں۔ فن کے زاویہ نظر سے بھی آپ بیتی لکھنے والے سے ایک ہی بات غرض ہے کہ واقعات کو اکٹھا کرنے کے بعد ان کی مناسب ترتیب و تدوین کریں۔ وہ اپنے زندگی کے حالات کو بالکل اسی طرح سامنے لائے جیسے وہ اس کی حیات میں پیش آئے تھے ۔ واقعات کی ترتیب کا وہی لحاظ رکھا جائے جو اصل زندگی میں تھا۔ زندگی کی ہر چیز تحریر کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس سے آپ بیتی غیر دلچسپ اور غیر ضروری طوالت کا شکار ہو جائے گی۔ آپ بیتی لکھتے ہوئے فن کاری، چابک دستی اور ہُنر مندی کی ضرورت ہے۔ سچائی، شخصیت اور فن کی حامل آپ بیتی اس تصویر کا نام ہے جِس میں مصّور اپنی تصویر کے خاکے میں خود رنگ بھرتا ہے۔

- واقعات کا صحیح انتخاب آپ بیتی کی اہم خوبیوں میں شمار ہوتا ہے۔ چونکہ اس صنف کا موضوع انسان کی اپنی ذات ہے اور وہ زندگی میں واقعات کے لامتناہی سلسلے سے گزرتا ہے۔ زندگی میں آنے والا ہر واقعہ کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا واقعات کا انتخاب مہارت سے سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ کئی دفعہ ایسا ہو جاتا ہے کہ کسی واقعے کو آپ بیتی نگار غیر معمولی اہمیت دے کر اپنی کتاب میں بہت اہم بیان کر دیتا ہے لیکن قاری کے لیے وہ بالکل غیر اہم ہوتا ہے۔ انور (۲۶) خود نوشت سوانح حیات" میں لکھتی ہیں:-

" ایک کامیاب آپ بیتی کے لیے زندگی کے پیچ در پیچ حالات سے واقعات تک کا صحیح انتخاب ان کے درمیان حسن تناسب اور حفظِ مراتب کا لحاظ رکھنا

اور ذہانت کے ساتھ ردّ و تبدل کے بعد خوش سلیقگی سے پیش کرنا نہ صرف
اہم بلکہ لازمی ہے۔"

- واقعات کے درست چناؤ کے ساتھ موضوع یا عنوان کا صحیح التزام بھی ضروری ہے۔ ایک آپ بیتی میں کیا کیا ہونا چاہیے؟ آپ بیتی نگار کے ذہن میں یہ بات واضح ہونی چاہیے۔ اکثر آپ بیتی لکھنے والے کوئی واقعہ قلم بند کرتے ہوئے جذباتی بہاؤ میں اپنے موضوع سے دُور نکل جاتے ہیں۔ یہ خامی خود نوشت نگاری میں عام ہے۔ اپنی ذات سے جُڑے واقعات کو بیان کرتے ہوئے بر سبیل تذکرہ اس عہد کے سیاسی، سماجی اور تاریخی واقعات بیان کرنے لگتے ہیں۔ جس سے بے جا طوالت طبعیت پر بوجھ بن کر اثر انداز ہوتی ہے۔ بعض لوگ اپنے آباؤ اجداد کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ بیتی کو تذکرہ بنا دیتے ہیں۔ ذات سے باہر کے واقعات خواہ کتنے ہی پُر لطف اور با مقصد ہوں قاری پر گراں گزرتے ہیں۔ اس لیے خود نوشت لکھنے کے دوران دماغ کو حاضر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔
- ہر شخص اپنے بارے میں کئی غلط فہمیوں یا خوش فہمیوں کا شکار ہوتا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف کی اپنی ذات "ہیرو" ہوتی ہے۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی کئی جگہ خود پسندی جھلکنے لگتی ہے جس سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔
- آپ بیتی لکھتے ہوئے رنگین بیانی کی توقع رکھنا عبث ہے لیکن اردو کی آپ بیتیوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یہ بات سامنے آئی ہے کہ قبولیت عام اُنھی آپ بیتیوں کو ہوئی جو حقائق کے بیان کے ساتھ اسلوب سے بھی آراستہ تھیں۔ ہر شخص کا اسلوبِ بیاں الگ ہوتا ہے اس لیے ہر فن پارہ نوعیت کے لحاظ سے مصنف کی شخصیت کے تابع ہوتا ہے۔ اسلوبِ بیاں مصنف کی شخصیت کا آئینہ ہے۔

آپ بیتی کو کیسا ہونا چاہیے اس بارے میں عبد اللہ (۲۷) کا خیال ہے خود نوشت کو ہر طرح سے فن کمال ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان میں موجود ہر شے میرے نقطہ نظر میں اشتہار ہے اور سوانح کی حدود میں شامل نہیں سے ہے۔

آپ بیتی معاشرے میں سچائی، اچھائی اور شرفِ انسانیت کے فروغ کا باعث بھی ہوتی ہے۔ وہ (۲۸) لکھتے ہیں:۔

"اصل سوال یہ ہے کہ شریعت کس طرح آدمیت میں، آدمیت کس طرح
انسانیت میں اور انسانیت کس طرح عظمت میں ڈھلی۔ ہر سوانح عمری
کے لیے ایسے ہی کسی معنی کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ بیتی کے اس کے
علاوہ بھی صدہا تقاضے اور مطالبے ہوتے ہیں۔"

سوانح نگاری کا فرض ہے کہ وہ کمپیوٹر کی طرح واقعات کو اس ترتیب اور فنی بصیرت سے پیش کرے کہ صاحب سوانح کی زندگی کی حقیقی ترجمانی ہو سکے اور اس کی تمام تر کامیابیوں اور ناکامیوں کو دلچسپ ادبی پیرائے میں اُجاگر کیا جا سکے۔

سوانح نگاری ایک ذہنی فن ہے لہٰذا اس کی ترتیب میں جذبہ احترام، شفقت، عقیدت اور مذہبی ایقان سے احتراز کرنا چاہیے۔ عقیدت فنی اعتبار سے سوانح کے لیے سب سے مہلک چیز ہے۔
فکشن نگار کرداروں کے ساتھ جذبے کی آمیزش کرتا ہے جبکہ سوانح نگار کو فنی لحاظ سے اس کی اجازت نہیں ہوتی، علی (۲۹) نے اپنی کتاب "اردو میں سوانح نگاری" میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:۔

> "سوانح نگاری انسان کے اخلاقی، تاریخی یا سائنسی تجسّس سے آزاد ہے۔ ان عظیم مفادات کو اس سے ضمنی مدد مل سکتی ہے، لیکن یہ اس کے مقصد میں شامل کرتی۔"

دنیائے ادب کی دلچسپ ترین اور جامع سوانح عمری "لائف آف جانسن" ۱۷۹۱ء میں شائع ہوئی۔ انیسویں صدی کے بیشتر قلم کاروں نے اسے نمونہ بنایا اور اس پر تنقید کر کے جدید امکانات و رجحانات کا راستہ کھول دیا، جن میں سے ایک نیا رجحان "علم النفس" کا ہے جِس کے زیرِ اثر سوانح عمری سیرت نگاری میں بدل گئی۔ جدید تذکرہ نگار کا کام محض اپنے ممدوح کے حالات پر روشنی ڈالنا نہیں بلکہ اس کی شخصیت کو طشت از بام کرنا اور ذہنی پیچیدگیوں اور ارتقاء کا سراغ لگانا بھی ہے۔ عظیم شخصیات کی سوانح عمریاں عزم و حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔ اُن کے عیوب بیان کرنے سے یہ مقصد زائل ہو جاتا ہے اس لیے موت کے بعد ان کا اظہار نامناسب ہے۔ مندرجہ بالا بحث کے تناظر میں اگر مولانا حالیؔ کی سوانح نگاری کا جائزہ لیا جائے تو "حیاتِ سعدی" سب سے کمزور نظر آتی ہے کیونکہ اس میں مواد کی کمی سب سے زیادہ کھٹکتی ہے۔ جبکہ "یادگارِ غالب" اور "حیاتِ جاوید" میں یہ خامی نظر نہیں آتی۔ "حیاتِ جاوید" میں مولانا حالیؔ سر سیّد احمد سے بہت زیادہ مرعوب نظر آتے ہیں۔ اسی لیے اُن کی بشری کمزوریوں اور خامیوں کا کُھل کر تذکرہ نہیں کرتے بلکہ طوالت دیتے چلے جاتے ہیں لیکن قاری ان بے جا وضاحتوں سے سمجھ جاتا ہے کہ کچھ تو ہے جِس کی پردہ داری ہے۔ اسی لیے ناقدین نے "حیاتِ جاوید" کو "کتاب المناقب" اور "مذل المداح قرار دیا ہے۔

انیسویں صدی میں دیگر فنی محاسن کے ساتھ آپ بیتی کے نفسیاتی پہلوؤں پر بھی خاطر خواہ توجہ کی گئی۔ روسو کی شہرہ آفاق آپ بیتی "اعترافات" اپنی شخصیت کا کھُلا اظہار ہے۔ عبداللہ (۳۰) اس کے بارے میں یوں اظہارِ رائے کرتے ہیں:۔

> "روسو کی تحریر میں خلوص کے ساتھ خوف بھی پایا جاتا ہے۔ پھر بھی روسو نے بتایا ہے کہ ایک اچھی آپ بیتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کُچھ نہ چھپائے اور بیرونی ملامت یا تحسین سے بے نیاز ہو کر ہر وہ بات کہہ دے جو اس کے کردار اور اس کی شخصیت کی مکمل نقل بن جائے۔"

سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ شخصیت کے ہر معمولی سے معمولی لیکن نتیجہ خیز عمل کو آپ بیتی کے مرقع میں مسجّع پیش کرے۔ سوانح نگاری کا کام واقعات کو من و عن پیش کرنے سے ختم نہیں ہوتا بلکہ اسے فنکارانہ بصیرت سے کام لے کر انسانی زندگی کی گوناگوں کیفیات کی ترجمانی کرنا ہوتی ہے۔

الغرض تمام مواد کی جستجو سے لے کر اسے منظّم اور باضابطہ انداز میں پیش کرنے تک تحقیقی عمل کا ایک طویل سلسلہ ہے جس سے سوانح نگار کو عہدہ بَر آ ہونا پڑتا ہے۔

فصل سوم

خود نوشت سوانح عمری کی عالمی روایت

"آپ" اور "بیتی" دو الفاظ کا مرکب ہے۔ ادبی اعتبار سے یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں پیدائش سے لے کر تا دم تحریر تک کے حالات مصنف اپنے قلم سے خود تحریر کرتا ہے۔ سلسلہ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے انسان کا روزمرہ کے جن امور سے واسطہ پڑتا ہے ان احوال و مشاہدات کی ترتیب کو آپ بیتی کہا جاتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والا اپنے حالاتِ زندگی پیدائش سے لے کر تا وقتِ تحریر تفصیل اور تسلسل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہ ایک شخصی اور ذاتی صنف ہے۔ لیڈر، عظیم شخصیات اور مشہور افراد اپنی زندگی کی داستان کو ترتیب دیتی ہیں تاکہ لوگ ان کی پرورش، تعلیم اور تربیت اور سماجی، ثقافتی، سماجی اور تہذیبی روایات سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ آپ بیتی میں ادیب اپنی ذات کا خود مدعی، گواہ اور جج بن کر حقائق سے پردہ اُٹھانا ہوتا ہے۔ اگر وہ حقائق کو طشت از بام کرنے کی بجائے اخفاء میں رکھ کر پردہ پوشی کرے گا تو یہ ادبی بد دیانتی ہے۔

(ا) عربی ادب میں آپ بیتی:

عرب شعر و شاعری اور خطابت کے رسیا تھے۔ فصاحت و بلاغت عربوں کی گویا گھٹی میں پڑی تھی۔ تہذیبی تمدن اور رکھ رکھاؤ سے آزاد اور بے ساختہ طبائع میں یوں بھی فطری موزونی کے اجزاء کچھ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ دورِ جہالت میں بھی تعلیم و تعلّم سے دُور ہونے کے باوجود عربوں میں کسی نہ کسی درجے کے شاعر یا خطیب ضرور موجود ہوتے تھے۔ زبان و بیان کی ہمہ گیری اور ذوق اظہار کی فراوانی کی بدولت عرب باشندے خود کو "زبان آور" اور دوسرے خِطوں کے رہنے والوں کو "اعجمی" یعنی گونگا کہہ کر پکارتے تھے۔ ما قبل اسلام دورِ جاہلیت میں شعر و سخن کی تقریباً تمام اقسام کسی نہ کسی صورت میں موجود تھیں۔ بعد میں یہی ابتدائی نقوش باقاعدہ اصناف کی شکل میں عربی کی ذخیرۂ ادب میں شامل ہوئے۔ ہیئت کے اعتبار سے قصیدہ، مثنوی، غزل، قطعہ، رباعی اور مخمس وغیرہ جبکہ موضوع کے لحاظ سے مدیح، تغزّل، رثا، حماسہ الغرض ہر قسم کی شاعری دورِ جاہلیت کے شعراء کے ہاں ملتی ہے۔ قصائد میں طربیہ، مدحیہ، بیانیہ، المیہ، رزمیہ اور ہجویہ ہر طرح کے نمونے موجود ہیں۔ مثنوی بھی عربوں کے ہاں زمانہ قدیم سے رائج تھی۔ شاعری عربوں کی زندگی اور واقعات کا روزنامچہ ہے۔ عرب جب ہندوستان آئے تو انھوں نے عصری واقعات کو منظوم کیا۔ محمد بن قاسم بذاتِ خود عربی کا قادر الکلام شاعر تھا۔ عربوں کے عہد میں عربی زبان کی ترویج ہوئی اور اسے پھلنے پھُولنے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب دورِ حکومت میں برِ صغیر کے مقامی لوگوں کو عربی زبان و ادب سے مستفیض ہونے کے مواقع میسّر آئے۔ سوانح نگاری کا سلسلہ بھی قدیم عرب شعراء کی شاعری سے جا کے جُڑ جاتا ہے۔ بعد ازاں عربی کے بڑے نظام نے باقاعدہ آپ بیتی لکھنے کی طرح ڈالی۔

عربی ادب میں آپ بیتی کی رعایت خاصی مستحکم اور جاندار ہے۔ علمائے اسلام میں امام غزالیؒ، ابنِ الجوزی اور ابنِ خلدون نے اپنی زندگی کے مشاہدات و تجربات کو آپ بیتی کی شکل میں قلم بند کیا ہے۔ عربی زبان میں لکھی گئی کئی آپ بیتیوں کا صاحبانِ علم و ادب نے اردو ترجمہ بھی کیا ہے جس کے براہِ راست اثرات اردو آپ بیتی پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں عربی ادب کی نامور شخصیت ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی آپ بیتی "الآیّام" نے کافی شہرت پائی۔ اسی طرح جامعہ دولی العربیہ (عرب لیگ) اور وزاعت مصارف کے ثقافتی ڈائریکٹر ڈاکٹر احمد امین جو جامعہ مصریہ میں عربی ادب کے پروفیسر بھی ہیں، کی آپ بیتی "حیاتی" عربی آپ بیتی کا معتبر حوالہ مانی جاتی ہے۔

(۲) فارسی ادب میں آپ بیتی:

فارسی ادب میں آپ بیتی کی روایت خاصی قدیم ہے۔ ابتداً تاریخ اور آپ بیتی میں کچھ زیادہ فرق رَوا نہیں رکھا جاتا تھا۔ کئی فارسی ادباء ایسے ہیں جن کے ہاں ان دونوں اصناف کا امتزاج ملتا ہے۔ گو یہ سلسلہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا تھا لیکن مسلم حکمرانوں کے دَور میں اس صنف نے فروغ پایا۔ احمد (31) اس ضمن میں قلم آراء ہیں کہ فارسی میں آپ بیتی کی روایت بہت پہلے سے موجود تھی۔ امیر تیمور کے ملفوظات، تزک بابری اور تزک جہانگیری سے آپ بیتی کے ابتدائی نقوش کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ فارسی کی ایک آپ بیتی شیخ علی فراقی نے اپنے دَور کے تاریخی اور سوانحی حالات پر قلم بند کی ہے۔ اردو کے نامور شاعر میر تقی میرؔ کی آپ بیتی "ذکرِ میر" بھی فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ فارسی حکمرانوں کی زبان تھی اس لیے اس زبان کی اصناف کی ترویج و ارتقاء قدرتی بات ہے۔ بادشاہوں نے اپنے اپنے عہد میں اپنے حالاتِ زندگی قلم بند کیے اور یوں فارسی ادب میں مغل بادشاہوں کی "تزوک" اہمیت کی حامل ٹھہریں۔ خانم (32) کہتی ہیں:

> "اگرچہ شہنشاہِ بابر کی تزکِ بابری اصل میں ترک زبان میں تھی مگر اکبر کے قلم سے اس کو فارسی میں منتقل کرایا گیا۔ بعد میں اس کے ترجمے انگریزی اور فارسی زبان میں ہوئے۔ "تزکِ بابری" میں بادشاہ کی اپنی ذات کی جھلک، زندگی کے حالات اور اس کے کارناموں کے علاوہ جو تاریخی واقعات و حالات (بادشاہ کے کارناموں کے ضمن میں آنے ضروری تھے) مل سکتے ہیں شاید وہ کسی اور جگہ نہ مل سکیں۔"

"تزکِ بابری" کی طرح "تزکِ جہانگیری" بھی آپ بیتی ہے جسے جہانگیر بادشاہ نے روزناموں کی شکل میں لکھا۔ اس تزک میں واقعات کو بِنا کسی رنگینی اور حاشیہ آرائی کے سچائی کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔

مغل شہنشاہ جہانگیر کی اس تزک (آپ بیتی) میں جہاں اُس کے انداز حکمرانی کا پتہ چلتا ہے وہیں اُس کی مہمات، سفری حالات، کارِ حکومت، علم الحیوانات، رعایا کی دادرسی، انصاف کی فراہمی، ادب پروری، علماو فقراء کی قدر دانی، شوقِ مصوری، نگار کی مہمات کا تفصیل سے تذکرہ ملتا ہے۔ اس تزک میں جہانگیر کی محققانہ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔
بادشاہوں کی آپ بیتیوں میں "تزکِ تیموری" کے نام سے امیر تیمور کے ملفوظات اور ابو طالب کے کیے ہوئے فارسی زبان میں ان کے تراجم فارسی ادب کا حِصہ ہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کی شہرہ آفاق کتاب "کشف المحجوب" میں بھی آپ بیتی کے عناصر ملتے ہیں۔ میر تقی میرؔ کی مشہور آپ بیتی "ذکرِ میر" فارسی زبان کی مشہور آپ بیتی ہے۔ جِن کے مطالعے کے بغیر میر کے کلام کی داخلی کیفیات کو سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔
خانم (33) لکھتی ہیں کہ میر کا رجحان اصل میں ذاتی بیان اور ذات کی تلاش کی طرف تھا۔ اس نے اپنے بارے میں ذاتی بیان شاعری کے پردوں میں بھی کیا ہو گا لیکن یہاں حال و احوال کی قلبی اور ذہنی کیفیتیں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ میر کے غم والم کی ساری وجہ اس آپ بیتی سے سمجھ آ جاتی ہے۔ غم کے ساتھ تعلق اور اس غم کی وجوہات اور ان پر اثرات، سب کچھ اور بہت سی چیزیں اس تصنیف میں نظر آتی ہیں اور حقیت یہ ہے کہ اگر یہ عظیم شاعر اپنی آپ بیتی کی صورت میں ایسا کارنامہ اپنے معتقدوں کے لیے نہ چھوڑ کر جاتے تو اُن زندگی کے حالات کے بارے میں بہت کم کسی کو واقفیت ہو سکتی۔

اردو ادب پر فارسی کے براہِ راست اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فارسی زبان نے اردو کی صورت گری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو نے اپنے ارتقائی مراحل میں کئی زبانوں کے اثرات قبول کیے لیکن فارسی کو ان میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ فارسی کے ساتھ اردو کا فطری رشتہ ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شعری سرمایہ فارسی ادب سے اور نثری سرمایہ مغربی ادب سے زیادہ متاثر ہوا۔ کلی طور پر فارسی کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ "کشف المحجوب" اور "ذکرِ میر" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

(۳) انگریزی ادب میں آپ بیتی کی مختصر روایت:

اُردو ادب کی بیشتر اصناف فارسی اور انگریزی سے مستعار ہیں اس لیے ان کی روایت کے لیے فارسی، عربی اور انگریزی تنقید سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ اردو میں صنفِ آپ بیتی کے ارتقاء اور روایت کو گہرائی سے جاننے کے لیے یہ ضروری ہے۔ اٹھارویں صدی میں انگریزی ادب سے براہِ راست متاثر ہو کر لکھی گئی لیکن فارسی اور عربی ادب میں اس کی روایت پہلے سے مستحکم تھی۔ قدیم مذہبی کُتب میں تحریر مختلف اَدوار کے واقعات اور معلومات کو بے شک ابتدائی نقوش کہا جا سکتا ہے لیکن انگریزی میں Autobiography کی اصطلاح باقاعدہ طور پر اٹھارویں صدی میں استعمال ہوئی۔

اس ضمن میں خانم (34) کہتی ہیں کہ پہلے پہل خود نوشت اور تاریخ میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ ہیروڈوٹس اور زلوفن کے کارناموں میں تاریخ اور خود نوشت کا ملاپ ملتا ہے۔ نفسیاتی اور اعترافی آپ بیتیاں رومن دور میں تحریر کرنے کا رجحان شروع ہوا۔ انگریزی میں شروع شروع میں نظم میں آپ بیتیاں لکھی گئیں مگر ۱۷۰۰ء سے پہلے بہت کم شائع ہوئیں۔

عیسائی مذہب میں "اعترافات" کا رواج بھی خود نوشت کی ابتدائی صورت کو اُجاگر کرتا ہے۔ عیسائیت میں کوئی شخص اگر اپنے گناہوں کا اعتراف کرلے تو بقول ان کے وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ چونکہ مصنف آپ بیتی لکھتے وقت اپنے زندگی میں پیش آنے والے حالات اور واقعات کو منظرِ عام پر لاتا ہے اور اپنی ناکامیوں اور گناہوں کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ اس لیے آپ بیتی ہی اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ اس حوالے سے انصاری (35) قلم آرا ہیں کہ آپ بیتی کو اعتراف کہنا بجا ہوگا۔ یہ لفظی مسیحی دینیات سے مستعار ہے۔ مسیحی کلیسا میں ہر شخص کے لیے یہ عمل ضروری ہوتا ہے کہ وہ پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ شرمندہ بھی ہو تاکہ اس کے پچھتاوے اور شرمندگی سے اس کے سابقہ گناہوں کے معافی ہو سکیں۔ اعتراف کرنے والے کی روح پاک صاف ہو جاتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو آپ بیتی انسان کے اعتراف کی کہانی ہے۔ اس لیے آپ بیتی میں ایک گہرا معرفت کا رنگ ملتا ہے۔

انگریزی لٹریچر کی روایت میں مذہبی افکار اور اُن کے اثرات سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا یوں ادب میں اس صنف کا تعلق بھی مسیحی تعلیمات سے جا ملتا ہے۔ اس مذہب کی بیشتر کتابوں میں اہم مذہبی شخصیات کی زندگی کے حالات و واقعات درج ہیں۔ Mrs.Burr (36) اپنی تصنیف "Autobiography" میں رقم طراز ہیں کہ خود نوشت سوانح عمری کی قدیم روایت عیسائی عہد سے شروع ہوتی ہے۔ گو مذہبی شخصیات مثلاً گوتم بدھ، کنفیوشس یا افلاطون کے ہاں کچھ عبارتیں اور مذہبی طرز کی اندرونی تفصیلات پائی جاتی ہیں اور سیزر کے تبصرے جو دنیاوی نوعیت کے ہونے کے باوجود آپ بیتی کی بہت بڑی کارآمد ثابت ہوتے ہیں لیکن عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کسی نے اس چیز کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

انگریزی ادب میں آپ بیتیاں منظوم اور اعترافات دونوں صورتوں میں ملتی ہیں اس حوالے سے سترہویں صدی انگریزی ادب میں آپ بیتی کے باقاعدہ آغاز کی صدی ہے۔ اٹھارویں صدی میں آپ بیتی پختگی کی طرف بڑھی اور انیسویں صدی میں آپ بیتی کا اپنا رنگ نمایاں اور گہرا ہوتا چلا گیا۔ ہربرٹ سپنسر، ٹرولوپ، ٹالسٹائی، چارلس ڈارون، الفریڈ رسل اور کارلائل کی تصنیف شدہ آپ بیتیاں اس دَور کی نمائندہ ہیں۔ انیسویں صدی میں آپ بیتی کے دوسرے فنی محاسن کے ساتھ ساتھ اس کے نفسیاتی پہلوؤں پر بھی خاطر خواہ توجہ دی گئی۔ روسو کی شہرہ آفاق آپ بیتی

اس دَور کی اہم آپ بیتی جانی جاتی ہے۔ روسو کی تحریر کردہ آپ بیتی "اعترافات" روسو کی شخصیت کا تفصیلی اظہار ہے۔ اتنا تفصیلی کہ یہ تصنیف بے باکی کا مظہر گردانی جانے لگی۔ اپنی ذاتی زندگی کے خفیہ پہلوؤں کو اس انداز میں عیاں کرنا صرف مغربی ادب میں ہی ممکن ہے۔

مغرب کے ادب کا مطالعہ و تجزیہ کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُن کے ہاں مغربی مزاج کی بے باکی عام ہے جسے وہ ادبی سچائی کا نام دیتے ہیں۔ ہر قسم کے حقائق کو بِنا کسی جھجھک کے احاطہ تحریر میں لے آنا ان کے نزدیک ادبی و اخلاقی جرات اور کمالِ فن ہے۔

مغربی ادب میں لکھی جانے والی آپ بیتیوں میں بے باکانہ اسلوب کی بنیادی وجہ وہاں کا ساز گار ماحول اور معاشرہ ہے۔ وہاں کی تہذیب صدیوں کا سفر طے کر کے ایک مخصوص تہذیبی سانچے میں ڈھل چکی ہے جبکہ ہمارے ہاں ہر معاملے میں ترقی پذیری چل رہی ہے۔ مشرق میں مختلف مکاتبِ فکر کے لوگ بستے ہیں اور اِن کے درمیان افہام و تفہیم کا عادہ بھی کم ہے۔ یہاں لوگ اپنے مشاہیر سے توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور وہ پوری نہ ہوں تو معاشرے میں اس کا فوری ردِ عمل سامنے آتا ہے۔ انتہا پسندی کے اس ماحول میں کوئی بھی کُھل کر اپنے بارے میں لکھنے سے گریز کرتا ہے۔ علم و ادب، سیاست یا دوسرے کسی میدان میں مشاہیر اپنی داستانِ زندگی کو احاطہ تحریر میں نہیں لاتے جِن سے ان کی شخصیت کا بُت تڑخنے کا اندیشہ ہو۔ وہ لوگوں کے دِلوں میں اپنے لیے منفی جذبات پیدا ہونے سے خائف رہتے ہیں۔ یہی عمل اُنھیں خود کے بارے میں لکھنے سے رکاوٹ بنتا ہے۔

مشرق کی نسبت مغرب میں سماجی و معاشرتی برائیوں کا دور دورہ ہے۔ خاص طور پر جنسی بے راہ روی جِسے مشرق میں فحاشی سمجھا جاتا ہے وہاں معمول کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں جب شخصیت اپنی زندگی کے جنسی پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے تو اِن کے ہاں کوئی ہیجانی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ وہاں یہ بات معمول کی بات سمجھی جات ہے اور ایسی تحریروں کو پڑھنے کے بعد عوام کا ردِ عمل اتنا شدید نہیں ہوتا جیسا عام طور پر ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ مغربی ادب میں اس روایت نے ہندوستان کے ادب پر بھی اپنے نقوش مرتب کیے ہیں جنہیں جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی بارات" اور ممتاز مفتی کی نیم آپ بیتی "علی پور کا ایلی" میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

نو آبادیات کے نتیجے میں مغرب سے بہت سے الفاظ نے برِ صغیر میں رواج پایا۔ کئی اصناف میں موضوع اور ہیئت میں واضح تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ اردو میں جو ابتدائی نقوش مختلف صورتوں میں خام نظر آتے تھے مغربی ادب کے زیرِ اثر باقاعدہ ادبی صنف کا رُوپ دھار گئے اور اس طرح یہ صنف بتدریج ترقی کرنے لگی۔

(۴) اردو ادب میں آپ بیتی کا آغاز و ارتقاء :

تخلیق بشر سے انسان نے اپنے ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ زندگی کے مقصد کو جاننے کی خواہش نے انسان کو ہمیشہ بے قرار اور متجسّس رکھا۔ زندگی کے تمام تجربات سے اہل معاشرہ کو آگاہ کرنا اس کے لیے تزکیہ نفس کا سبب رہا ہے۔

اہلِ فن شخصیات نے اپنی ذات اور فن کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے مختلف ادبی اصناف کا سہارا لیا ہے۔ جِن میں تذکرے، خطوط، انٹرویوز اور روزنامچے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان اصنافِ ادب میں مصنف اپنی داستانِ حیات کو مختلف انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ وہ اصنافِ ادب ہیں جِن میں ہم آپ بیتی کے ابتدائی عناصر بہتر طریقے پر دیکھ سکتے ہیں۔

انٹرویو:

مشہور شخصیت کے ذاتی حالات کو عوام تک پہنچانے کے لیے انٹرویوز لیے جاتے ہیں۔ یہ انٹرویوز رسائل، جرائد، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان انٹرویوز کے ذریعے نامور شخصیات کے تجربات، نظریات اور حقائق تک رسائی ہوتی ہے۔ انٹرویوز ادبی لحاظ سے ایک مؤثر آپ بیتی کو ترتیب دینے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر ان اہل فن کے انٹرویوز کو مربوط انداز میں چھاپ دیا جائے تو ان شخصیات کی ذات کے خفیہ گوشوں تک رسائی ہو سکتی ہے۔

تذکرے:

تذکرہ نگاری کی صنف ادب میں بہت پُرانی ہے۔ یہ صنف عربی سے فارسی اور پھر اردو میں آئی۔ اردو میں اس کا آغاز "نکات الشعراء" سے ہوتا ہے جو میر تقی میر کا تذکرہ ہے۔ تذکرہ نگاری میں شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، محمد حسین آزادؔ، مولوی عبدالحق، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تذکروں میں شعراء اور ادباء کی حیات کے گوشوں کو موضوعِ سُخن بنایا گیا ہے۔ یہی چیز تذکروں کو آپ بیتی کے قریب لے آتی ہے۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تذکروں میں آپ بیتی کے عناصر موجود ہیں۔ سوانح نگاری کو ان تذکروں کی بدولت بہت فائدہ ہوا۔ مولانا الطاف حسین حالی کو اردو ادب میں پہلا سوانح نگار کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے سوانح نگاری کو تذکرہ نگاری کی رِیت سے آزاد کر دیا۔ الطاف حسین حالی کی پہلی سوانح نگاری "حیاتِ سعدی" تھی اس میں انھوں نے شیخ سعدی کے حالاتِ زندگی کو جامعیت سے پیش کیا۔ حالی کی دوسری سوانح عُمری مرزا اسد اللہ غالبؔ کے بارے میں ہے جس کا نام "یادگارِ غالب" ہے۔ حالیؔ کے بہت قریب سے غالب کو دیکھ کر

تجزیاتی انداز میں سوانح عمری تحریر کی ہے۔ حالی کی تیسری سوانح عمری "حیاتِ جاوید" ہے۔ یہ سر سیّد احمد خاں کے حالاتِ زندگی کا خلاصہ ہے۔ اس میں سر سیّد کی سماجی، سیاسی، مذہبی اور تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
اس دَور میں مولانا الطاف حسین حالیؔ کے علاوہ مولانا شبلی نعمانی، ذکا اللہ، نذیر احمد، چراغ علی اور عبدالحلیم شررؔ نے مختلف شخصیات کی سوانح عمریاں تحریر کیں۔ ان سوانح عمریوں اور تذکروں میں ایسی تفصیلات درج ہیں جِن سے کسی کی پوری زندگی کا احاطہ کیا جاسکے۔ مگر ان میں نامور شخصیات کے سوانحی حالات، اس عہد کے مخصوص میلانات و رجحانات سے ہمیں بخوبی آگاہی ہوتی ہے۔

روزنامچے:

روزانہ کے گزرے ہوئے واقعات، تجربات، مشاہدات اور احساسات کو "روزنامچے" میں درج کیا جاتا ہے۔ روزنامچے کے توسّط سے اردو میں زبانی اعتبار سے مکمل آپ بیتیاں ملتی ہیں۔ کیونکہ اس میں مصنف کی روز مرّہ زندگی کا تفصیلی تذکرہ ہوتا ہے۔ آپ بیتی کو تحریر کرنے میں روزنامچے کی بہت اہمیت ہے۔ انکشافِ ذات کے حوالے سے دیکھا جائے تو روزنامچہ آپ بیتی کے قریب تر ہے۔ آپ بیتی میں یاد اور یادداشت کا بڑا عمل دخل ہے۔ کمزور حافظے والے کی آپ بیتی ناقابلِ اعتبار ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں روزنامچہ ایک اہم دستاویز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوانح نگار روزنامچے کی مدد سے سوانح عمری کر مرتب کرتے ہیں۔

مکتوبات:

مکتوبات اپنے احوال دوسرے تک پہنچانے کا اب تک وسیع ذریعہ رہا ہے۔ چونکہ خط میں ہم اپنے جذبات اور احساسات کو لکھ کر بیان کر رہے ہوتے ہیں اس لیے ان میں ایسی باتیں بھی بآسانی کہی جاسکتی ہیں جِن کو ہم بالمشافہ شاید نہ کہہ پاتے۔ خطوط میں ایک ہی وقت میں کئی موضوعات پر بات کی جاسکتی ہے۔ مکتوبات نگای میں آپ بیتی کی طرح اپنی ذاتی باتوں کا کھلم کھُلا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکتوب نگاری میں آپ بیتی کے عناصر کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اردو مکتوب نگاری کی روایت غالب کے خطوط سے بہت مشہور ہوئی۔ خطوطِ غالب کے دو مجموعے "عود ہندی" اور "اردوئے معلّی" کے نام سے منصئہ شہود پر آئے۔ ان خطوط کے مطالعے سے غالب کی زندگی کی تصویر کی صورت قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ خطوط کسی انسان کی شخصیت کو جاننے کا ایسا دروازہ ہوتے ہیں جن میں داخل ہوئے بغیر کسی انسان کی اصلیت اور اس کی شخصیت کے بارے میں ہم آگاہ نہیں ہوسکتے۔ مولانا شبلی نعمانی، علامہ محمد اقبال، ابوالکلام آزاد، مشفق خواجہ کے خطوط خاصے کی چیز ہیں۔
۱۸۵۷ء کے بعد باقاعدہ آپ بیتیاں لکھی جانے لگیں لیکن یہ اس صنف کی ابتدائی شکل ہی شمار ہوتی ہے۔ اردو آپ بیتیوں کے نقوش شروع میں مختلف صورتوں میں سامنے آتے رہے ہیں۔ جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان میں باقاعدہ

آپ بیتیاں تحریر کرنے کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس صنف نے اپنا آغاز بیسویں صدی میں کیا ہے۔ گو اردو ادب میں آپ بیتی مختلف ہیئتوں میں موجود تھی لیکن اس کو با قاعدہ صنف کا درجہ بیسویں صدی میں ہی حاصل ہوا۔ سالک (۳۷) رقم طراز ہیں کہ اس دَور میں چند اہل علم نے جنگِ آزادی کے حالات اور واقعات، اہم خدمات اور اپنے مشاہدات کو زیر قلم لانا شروع کر دیا تھا۔ آپ بیتیاں لکھنے کا رجحان ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا تھا۔ جس طرح ملک ترقی کرتا رہا اس طرح آپ بیتیاں بھی تحریر ہونے لگیں۔

اردو ادبیات میں جنگِ آزادی کے حالات لکھنے والوں نے آپ بیتی کو روزناچوں کے انداز میں لکھنا شروع کیا۔ بعد میں یہی روزنامچے آپ بیتی کہلانے لگے۔ سالک (۳۸) "نقوش" آپ بیتی نمبر میں لکھتے ہیں کہ اردو ادب میں سب سے پہلی با قاعدہ آپ بیتی جس میں ادیب کی زندگی کے احوال درج کیے گئے ہیں ۔ مولانا جعفر تھانیسری نے اُردو کی پہلی خودنوشت "کالا پانی" کے نام سے 1879ء میں لکھی جو ۱۸۸۴ء کو شائع ہوئی، جس کا تاریخی نام "تواریخ عجیب ہے۔"

نواب اکبر علی خان کی بیٹی شہر بانو بیگم نے اپنی آپ بیتی "بیتی کہانی" کے نام سے قلم بند کی ہے اور ۱۸۸۷ء میں دیباچے کے اضافے کے ساتھ کتابی شکل دی۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اس خودنوشت کو از سرِ نو ترتیب دے کر ۱۹۹۵ء میں شائع کیا اور اسے اُردو کی پہلی آپ بیتی قرار دیا۔ یہ تینوں آپ بیتیاں اردو زبان کی پہلی آپ بیتیاں کہی جا سکتی ہیں اور ان کے مصنفین کا تعلق اردو شعر و ادب سے ہی تھا۔

عبد الغفور کی وفات ۱۴ جون ۱۸۸۹ء کو ہوئی لیکن آپ بیتی میں ۱۸۸۶ء تک کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اردو اور فارسی زبان و ادب کے جیّد عالم کی حیثیت سے عبد الغفور نسّاخ کا نام ایک معتبر حوالے کے طور پر قابلِ احترام سمجھا جاتا تھا۔ اس حوالے سے تسّیم (۳۹) لکھتے ہیں:

> "عبد الغفور نسّاخ کی اس آپ بیتی میں طرزِ تحریر نہایت صاف اور سادہ ہے۔ بیانیہ اسلوب کے باوجود کہیں کہیں واقعات کی کڑیوں میں بے ربطی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ بیتی میں استعمال ہونے والے اکثر الفاظ و محاورات اب متروک ہو چکے ہیں۔ البتہ نساخ کا اسلوب موزوں اور قابلِ ستائش ہے۔ نسّاخ نے اپنی زندگی میں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اُسے اسی طرح اپنے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی۔"

اُن کی یہ کاوش بعد میں آنے والے سوانح نگاروں کے لیے مثال بنی۔ زبان و بیان کی معمولی خامیوں کے باوجود اس آپ بیتی سے اس عہد کو سمجھنے میں گراں قدر مدد ملتی ہے۔ اردو ادب کی پہلی آپ بیتی ہونے کے باعث اِس کی سوانحی ادب میں ہمیشہ خصوصی اہمیت رہے گی۔ "داستان غدر" میں ظہیر دہلوی کے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے پسِ منظر میں تحریر کی گئی آپ بیتی ہے۔ اس کا شمار ابتدائی دَور کی اہم آپ بیتیوں میں ہوتا ہے۔ ظہیر دہلوی

(ہندوستان کے) آخری مغل بادشاہ بہادُر شاہ ظفر کے دربار میں بطور داروغہ نوکری کرتے تھے۔ اس لیے وہ جنگِ آزادی کے چشم دید گواہ تھے۔ اس اعتبار سے ان کہ یہ آپ بیتی صداقت پر مبنی ہے۔ "داستانِ غدر" کا پہلا ایڈیشن ۱915ء میں شائع ہوا۔ اس کے اسلوب اور متن سے ظہیر دہلوی کی دِلی شہر سے محبت کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ ظہیر دہلوی استاد ذوق کے شاگرد بھی تھے۔ ذوق کے شاگردوں میں جس طرح مولانا محمد حسین آزاد نے جدید اردو نظم کو پروان چڑھایا اسی طرح ظہیرؔ دہلوی نے اردو نثر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ "داستان غدر" کا دوسرا ایڈیشن جون ۱۹۵۵ء میں اکادمی پنجاب لاہور سے شائع ہوا۔

حسرت موہانی بلند پایہ شاعر، عظیم المرتبت صحافی اور تحریکِ آزادی کے جانثار کارکن تھے۔ اردو شعر و ادب میں غزل کی تازہ کاری کے حوالے سے انھیں "رئیس المتغزلین" کہا جاتا ہے۔ مولانا حسرت موہانی کو ۱۹۰۸ء میں "اردوئے معلّی" رسالے میں انگریزوں کے خلاف مضمون لکھنے کی پاداش میں ایک سال کی قید بامشقت کاٹنی پڑی۔

قیدیوں کے ساتھ ہونے والے سلوک اور جیل کے اندرونی حالات کے حسرت موہانی دردمندانہ انداز میں اپنی آپ بیتی "قیدِ فرنگ" میں تحریر کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں جہاں حسرت موہانی کی قید و بند کی صعوبتوں کا احوال رقم ہے وہیں ان کا زندانی کلام بھی شاملِ کتاب ہے۔ جو انھوں نے چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ تخلیق کیا۔ یہ شہرۂ آفاق شعر حسرت موہانی نے وہیں کہا

ؔ ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

یہ آپ بیتی اگرچہ سوانحی ادب میں نمایاں مقام نہ پا سکی لیکن بقول ناقدین اس کا اسلوب عمدہ ہے اور یہ حسرت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں ممد و معاون ہے۔ "تذکرہ" مولانا ابوالکلام آزاد کی داستانِ زندگی ہے۔ یہ آپ بیتی اُن کی نظر بندی کے دوران لکھی گئی۔ ستمبر ۱۹۱۶ء میں اس کا پہلا ایڈیشن "البلاغ" میں شائع ہوا۔ بقول احمد (۴۰):-

> "اس آپ بیتی کا زیادہ تر حِصہ سماجی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی مسائل پر مبنی ہے۔ آزاد خاندانی حالات کا بہت کم ذکر کرتے ہیں۔ اس میں حق گوئی سے کام نہیں لیا گیا، تاہم اتنا ضرور ہے کہ یہ کتاب مولانا کے طرزِ تحریر سے متعارف کراتی ہے۔"

اس آپ بیتی میں مولانا آزادؔ نے خود کو چھپانے کی دانستہ کوشش کی ہے۔ "تذکرہ" کی فنی خامیوں کے بارے خود مولانا آزادؔ (۴۱) لکھتے ہیں:-

"متعدد حصے نظرِ ثانی کے محتاج تھے۔ ضمنی مطالب میں بھی بہت طول ہو گیا۔ نہیں معلوم نظرِ ثانی کے بعد کتاب کی صورت کیا ہوتی لیکن مرزا فضل الدین احمد صاحب نے بعد میرے علم و مشورہ کے، اصل مسوّدہ چھاپنا شروع کر دیا۔ مجھے جب اطلاع ملی تو دو تہائی سے زیادہ چھپ چکا تھا۔ مرزا صاحب کے تعجیل، اُن کے ذوق و شوقِ محبت کا نتیجہ ہے، اُن کا شکر گزار ہوں۔ کتاب کے نقائص میرے نقص کار و صنف قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس کے شرح سار و معافی خواہ ہوں۔"

"تذکرہ" آپ بیتی، مولانا ابوالکلام آزاد کی علمیت اور شاعرانہ عظمت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی آپ بیتی کا دوسرا ایڈیشن ۳۴۴صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹۲۱ء میں تحریر کی گئی۔ اس آپ بیتی میں مولانا نے اپنے آباؤاجداد کے کارناموں کو بطور خاص جگہ دی ہے۔

"قیدِ یاغستان" ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ محمد اکرم صدیقی کی آپ بیتی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۰ء دوسرا ۱۹۳۷ء اور تیسرا ۱۹۵۱ء میں شائع کیا گیا۔ اس آپ بیتی میں مصنف کے پینتالیس دن کا احوال ہے جو انھوں نے ملازمت کے دوران گرفتار ہونے کے بعد گزارے۔ اس آپ بیتی میں صوبہ سرحد کے حالات، انگریزی حکومت کے اثرات، افغانستان کی سیاسی صورتِ حال اور اس وقت کے سیاسی و سماجی احوال کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ آپ بیتی سے زیادہ "رو داد" کے قریب تر ہے۔ اس کا دور بھی محدود ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی خود نوشت کا نام " آپ بیتی " ہے جس کا سن ۱۹۱۹ء ہے یہ دوسری بار ۱۹۲۲ء میں طبع ہوئی، معاشرتی اور سیاسی منظر نامے کا پتہ چلتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۳۳ء میں نواب آغا مرزا بیگ خان بہادر سرور جنگ کی آپ بیتی "کارنامہ سروری" شائع ہوئی۔ اس کے آغاز میں مغلوں کے زوال دہلی کے احوال کا اور دوسرے حصے میں اپنی ملازمت اور ازدواجی زندگی کے حالات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ آپ بیتی اس دَور کی آپ بیتیوں کی نسبتاً سماجی عوامل کے بیان کا مُنہ بولتا مرقع ہے۔

سیّد ہمایوں مرزا کی آپ بیتی "میری کہانی میری زبانی" ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ مصنف نے بچپن سے جوانی تک کے اہم واقعات کو ضبط تحریر کیا ہے۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے انگلستان کا سفر کرنا، وہاں قیام اور وہاں کے شب و روز اور معاشرت کا مکمل جائزہ اس آپ بیتی کا حِصہ ہے۔

عبدالغفار مدھوبی کی آپ بیتی "ایک معلّم کی زندگی" دو جِلدوں پر مشتمل ۱۹۴۲ء میں طبع ہوئی۔ یہ آپ بیتی مصنف کے اکیس سالوں کا نچوڑ ہے۔ عبدالغفار مدھوبی نے پہلی جلد میں اپنی زندگی کے ۱۴ برسوں کا اور دوسری جلد میں ۷ برسوں کے اہم واقعات کا احاطہ کیا ہے۔

۱۹۴۳ء میں سر سیّد رضا علی کی داستانِ زندگی "اعمال نامہ" ہندوستان پبلشرز دلّی نے شائع کیا۔ اس آپ بیتی میں مصنف نے تصاویر کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ ۱۴ ابواب میں منقسم ہے۔ مصنف کے ذاتی احوال کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کو بھی مفصل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس آپ بیتی کو اِنھی خصوصیات کی بنیاد پر اردو ادب کی پہلی مکمل اور مفصّل آپ بیتی سمجھا جاتا ہے۔

اردو آپ بیتیوں کی روایت میں حکیم احمد شجاع کی آپ بیتی "خوں بہا" اہم مقام کی مالک ہے۔ ۱۹۴۳ء میں مرکنٹائل پریس لاہور نے شائع کیا۔ آپ بیتی میں علی کالج کے ادبی ماحول، تعلیمی روایات، دوست احباب، اساتذہ اور ملازمین کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

چودھری افضل کی آپ بیتی "میرا افسانہ" پہلی بار ۱۹۴۳ء میں تاج کمپنی لمٹیڈ لاہور کے زیرِ اہتمام ہوئی۔ یہ آپ بیتی ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے دو حِصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آپ بیتی کا پہلا حِصہ دوسرے کی نسبت زیادہ دلکش ہے۔ "میرا افسانہ" اردو آپ بیتی کی روایت میں بہترین اضافہ سمجھی جاتی ہے۔ اس آپ بیتی میں ہندوستان کی سیاسی و سماجی زندگی کی بہترین انداز میں تصویر کشی ملتی ہے۔

شوکت تھانوی اردو فکشن کا جانا پہنچانا نام ہے۔ اِن کی آپ بیتی "مابدولت" کے نام سے پہلی بار ۱۹۴۵ء میں دوسری بار ۱۹۴۶ء میں اور تیسری دفعہ ادارہ فروغِ اردو لاہور سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ اس آپ بیتی میں مصنف نے اپنے ذاتی احوال میں تعلیمی سرگرمیاں، لکھنے لکھانے کا ذوق اور ریڈیو کے حوالے سے اپنے شب و روز کو بیان کیا ہے۔

مندرجہ بالا تذکرہ اُن آپ بیتیوں کا تھا جو تقسیم تک منظرِ عام پر آتیں اس کے بعد کچھ عرصہ حالات کے ساز گار ہونے میں لگا۔

مولانا سیّد احمد مدنی کی خودنوشت "نقشِ حیات" ۱۹۵۲ء میں چھپی۔ آپ بیتی کے شروع میں اس تحریر کرنے کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ ۱۹۴۴ء میں جب وہ نینی تال جیل میں قید تھے تو چند دوستوں کے اصرار پر انھوں نے اپنی داستانِ حیات لکھنے کا آغاز کیا۔ اپنے ذاتی حالات آپ میں لکھنے کے ساتھ مولانا نے ہندوستان میں انگریزوں کے آنے، ہندوستانیوں کے عروج و زوال، انگریزوں کی پُر فریب چالوں اور مکر و فریب میں مبنی حکومتی پالیسیوں تحریکِ محریّت کے اسباب، اثرات اور ہندوستان میں انقلابی تحریکوں کا جائزہ لیا ہے۔

سیّد فضل الحسن حسرت موہانی کی آپ بیتیوں کو نیاز فتح پوری نے ۱۹۵۲ء میں شائع کرایا۔ اس آپ بیتی میں حسرت موہانی کی قید کے حالات و واقعات اور اِن کا زندانی کلام شامل ہے۔

۱۹۵۵ء میں "مشاہدات" کے نام سے ہوش بلگرامی کی تصنیف سامنے آئی۔ اس میں مصنف نے حیدرآبادی تہذیب، اپنے بچپن کے حالات تعلیم اور زندگی کے یادگار حقائق کا تذکرہ کیا ہے۔ عبدالمجید سالکؔ کی آپ بیتی "سرگزشت"

مولانا چراغ حسن حسرت کے کہنے پر تحریر کی گئی۔ ۱۹۵۵ء میں اسے قومی کتب خانہ لاہور نے شائع کیا۔ عبدالمجید سالکؔ کی آپ بیتی میں اس دَور کا سیاسی اور ادبی ہندوستان پوری طرح جلوہ گر ہے۔ یہ آپ بیتی برِ صغیر پاک و ہند اور خاص طور پر پنجاب کی سیاسی، ادبی اور مجلسی زندگی کی اہم یادداشت ہے۔

اردو کی اہم آپ بیتیوں میں ایک دیوان سنگھ مفتون کی تحریر کردہ آپ بیتی "ناقابلِ فراموش" ہے۔ ۶۳۱ صفحات پر مشتمل یہ آپ بیتی مصنف کی زندگی میں پیش آنے والے مشاہدات اور واقعات پر مشتمل ہے۔ انگریزوں کی مکاری، ماملتا، صحافیانہ زندگی، ہندوستانی سیاست ، ریاستی حکمرانوں کا طرزِ عمل اور ہندوستان کا سماجیات اس کے خاص موضوعات ہیں۔

شاد عظیم آبادی نے "شاد کی کہانی، شاد کی زبانی" کے عنوان سے اپنی آپ بیتی اپنے ایک شاگرد مسلم عظیم آبادی کے حوالے کر کے وصیّت کی تھی کہ بعد از مرگ اسے چھپوایا جائے۔ خود شادؔ نے اس کا نام "کمال عمر" رکھا تھا لیکن شاد کے شاگرد نے ۱۹۵۷ء میں اسے موجودہ عنوان سے انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کرایا۔ یہ آپ بیتی ۲۸۱ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

مولوی فیروز الدین کی پونے چار سو صفحات پر مشتمل ضخیم آپ بیتی "جہادِ زندگانی" ۱۹۵۸ء میں فیروز سنز نے شائع کی۔ یہ آپ بیتی بیسویں صدی کے برطانوی ہند کے سیاسی، سماجی حالات کی منھ بولتی تصویر ہے۔ ۱۹۶۱ء میں "علی پور کا ایلی" کے نام سے افسانوی طرز کی آپ بیتی مصنف ممتاز مفتی نے شائع کرائی۔ اس میں الیاس عرف ایلی دراصل مصنف ممتاز مفتی خود ہے۔ ممتاز مفتی نے اس میں چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کا خیال رکھا ہے۔

سیّد ذوالفقار علی بخاری جنھوں نے زیڈ اے بخاری کے نام سے شہرت پائی اُن کی آپ بیتی "سرگزشت" کے نام سے معارف لمٹیڈ کراچی سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ آپ بیتی برِ صغیر کی نشریات کی مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں براڈکاسٹنگ دنیا کے حالات و واقعات کو تفصیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

"بجنگ آمد" مقبولِ عام آپ بیتی کرنل محمد خاں کی فوجی زندگی پر مشتمل ہے۔ اس کی لَے مزاحیہ ہے اور یہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء کے اہم سیاسی واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ دوستوں کا تذکرہ دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ کرنل محمد خاں نے آپ بیتی کو دلچسپ بنانے کے لیے واقعات کو پُر لطف انداز سے بیان کیا ہے۔

جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی "یادوں کی برات" ۱۹۷۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ جوش ملیح آبادی اردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ وہ اردو زبان پر بہتر تصرف رکھتے تھے۔ اپنی اِنھی خداداد لسانی صلاحیتوں کے سبب انھوں نے "قومی اردو لغت" کی ترتیب و تالیف میں بھرپور صارفت کی اور انجمن ترقی اردو کراچی اور دارالترجمہ حیدر آباد دکن میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان کی آپ بیتی میں رجائیت پسندی ملتی ہے۔ اس میں مایوسیوں، ناکامیوں اور

محرومیوں کی بجائے عیش و نشاط، رنگینیاں اور دل فریبیاں پائی جاتی ہیں۔ آپ بیتی بظاہر حقائق پر مبنی نظر آتی ہے۔ دوسری طرف حقائق کی صداقت کے تعین میں دشواری پیش آتی ہے۔ شعر گوئی، عشق بازی، حصولِ علم اور انسانی دوستی کا مصنف نے خصوصیت سے تذکرہ کیاہے۔ "یادوں کی برات" تہذیب، سیاست، معاشرت اور سماجی احوال کا تذکرہ ہے۔

رشید احمد صدیقی کی "آشفتہ بیانی میری"، ۱۹۷۲ء میں بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل (۱۹۷۲ء) شورش کا شمیری، "جہانِ دانش" احسان دانش (۱۹۷۳ء)، غلام السیدین کی "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں" (۱۹۷۴ء)، "مہ و سال آشنائی" فیض احمد فیض (۱۹۷۵ء) مشتاق احمد یوسفی کی آپ بیتی "زر گزشت" (۱۹۷۶ء)، امر تا پریتم "رسیدی ٹکٹ" (۱۹۷۶ء) لال دھاگے (۱۹۷۷ء) قرۃ العین حیدر "کارِ جہاں دراز ہے" (۱۹۷۷ء پہلی جِلد اور ۱۹۷۹ء دوسری جِلد) عبد الماجد دریا آبادی کی خود نوشت "یادوں کا جشن" (۱۹۸۳ء)، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی "گردِ راہ" (۱۹۸۴ء)، ڈاکٹر وزیر آغا" شام کی منڈیر سے "(۱۹۸۶ء)، شہرت بخاری کی "کھوئے ہوؤں کی جستجو" (۱۹۸۷ء)، "شہاب نامہ" قدرت اللہ شہاب (۱۹۸۷ء)، حمید نسیم کی "ناممکن کی جستجو" (۱۹۹۰ء)، "صبح کرنا شام کا" آفاق صدیقی (2000ء)، "گئے دنوں کا سراغ"، مظفر وارثی (۲۰۰۰ء) اختر الایمان کی آپ بیتی "اس آباد خرابے میں"، ڈاکٹر رشید امجد "تمنا ہے بے تاب" (۲۰۰۱ء)، مہدی علی صدیقی کی "بلا کم و کاست" (۲۰۰۲ء)، ڈاکٹر سلیم اختر کی خود نوشت "نشانِ جگر سوختہ" (۲۰۰۵ء)، ساقی فاروقی "پاپ بیتی" (۲۰۰۹ء)، حبیب جالب کی خود نوشت "جالب بیتی" (۲۰۱۳ء) اور ڈاکٹر رشید امجد کی دوسری آپ بیتی "عاشقی صبر طلب" (۲۰۱۵ء)، طارق محمود "دامِ خیال" (۲۰۲۲ء) میں شائع ہوئی۔ اِن آپ بیتیوں میں مصنف کے ذاتی احوال، سرگرمیوں، مصائب کے علاہ اس عہد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی روّیوں کا بھی ذکر ملتا ہے یوں یہ آپ بیتیاں عصری منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔

آپ بیتیوں کی ایک قسم سیاسی مشاہیر سے بھی تعلق رکھتی ہے جِس میں سیاست کی مایہ ناز شخصیات نے اپنی زندگی کے متعلق آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ ان شخصیات کی آپ بیتیوں میں جنرل ایوب کی آپ بیتی، "جِس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی"، بے نظیر بھٹو کی "دخترِ مشرق"، میاں منظور احمد وٹو کی "جرمِ سیاست"، یوسف رضا گیلانی کی "چاہِ یوسف سے صدا"، جاوید ہاشمی کی "میں باغی ہوں" شامل ہیں۔

اردو ادب میں خواتین آپ بیتی نگاروں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن سب سے اہم معاشرے میں اخلاقی جرات کی کمی اور اظہارِ بیان کا فقدان ہی نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں عورت کی نسبت مرد زیادہ آزاد ہے اس لیے اُسے اظہارِ رائے کی بھی اتنی ہی آزادی ہے۔ تہذیبی، سماجی اور مذہبی حدود و قیود کے باوجود کچھ خواتین نے ادبی کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔ خواتین کی آپ بیتیوں میں زیادہ تر چار دیواری کے اندر کی دنیا

کے مشاہدات اور تجزیات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ان تحریروں میں بے جا معاشرتی پابندیوں سے آزادی کی عملی کوشش کے پہلوؤں کو آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔

اردو زبان کی کسی خاتون کی پہلی خود نوشت شہر بانو بیگم کی "بیتی کہانی" کے نام سے ہے۔ اس کا سنِ اشاعت ۱۸۸۵ء ہے۔۱۸۸۷ء میں اسے دیباچے کے اضافے ساتھ کتابی شکل دی گئی اور ۱۹۹۵ء میں اسے معین الدین عقیل نے از سرِ نو ترتیب دے کر شائع کیا۔ آپ بیتی کا موضوع زیادہ تر جنگِ آزادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے دردناک حالات ہیں۔اِن میں جو حالات واقعات بیان کیے گئے ہیں ان کی تصدیق بھری ماخذات سے ہو جاتی ہے۔"بیتی کہانی" سے اس دَور کے نسائی ادب کے معیار کا بھی تعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ "نَیر نگی بخت" یا "میری اپنی کہانی" کی مصنفہ انیس قدوائی ہیں۔ یہ آپ بیتی ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ بیگم انیس قدوائی باقاعدہ کسی تعلیمی ادارے سے سند یافتہ نہ تھیں۔ سختی اور پابندی کے ماحول میں اس طرح کسی خاتون کا آپ بیتی لکھنا بڑی جرات کا کام ہے۔ اس آپ بیتی میں سچائی کا عنصر اس حد تک ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ افسانوی انداز میں لکھی گئی اس آپ بیتی میں واقعات کی ترتیب عمدہ اور اندازِ بیاں شگفتہ ہے۔

۱۹۷۳ء میں بیگم پاشا صوفی کی آپ بیتی "ہماری زندگی" کراچی سے طبع ہوئی۔ مصنفہ نے اس میں اپنے ذاتی کوائف کے علاوہ خاندانی حالات بھی رقم کیے ہیں۔

سعیدہ بانو ریڈیو میں ملازمت کرتی تھیں، "ڈگر سے ہٹ کے" اُن کی آپ بیتی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنا بچپن، تعلیم، ملازمت کی سرگرمیاں، شوہر کے ساتھ گزرے ایام اور جواہر لال نہرو سے ملاقات کا دلچسپ حال رقم کیا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد جِن مشکلات کا سامنا مصنفہ اور اُن کے بچوں کو کرنا پڑا اس کا حال انھوں نے نہایت رقیق القلبی سے کیا ہے۔

نصرت جہاں سلیم فوج سے وابستہ تھیں۔ میڈیکل کے شعبے میں ترقی کی منازل طے کرتی ہوئی وہ بریگیڈیئر کے عہدے تک پہنچیں۔ اُن کی قابلیت اور خدمات کے اعتراف میں انھیں تمغہ امتیاز (ملٹری) اور تمغہ قائداعظم سے نوازا گیا۔ ماں باپ کی رحلت کے بعد مردانہ وار میدانِ عمل میں اُترنے والی اس خاتوں نے اس آپ بیتی میں اپنے تجربات کا فنکارانہ اظہار کیا ہے۔ یہ ایک خاتون کی آپ بیتی ہے جِس کا ادب سے تعلق نہیں تھا لیکن اسلوب کے اعتبار سے سادگی اور صداقت تحریر کو عمدہ ثابت کرتی ہے۔ یہ آپ بیتی ۱۹۹۰ء میں اسلام آباد سے شائع ہوئی۔

قرۃ العین حیدر نامور ادیبہ ہیں۔ اردو ادب سے وابستہ خواتین میں قرۃ العین سرِ فہرست ہیں۔ "کارِ جہاں دراز ہے" ا ن کی آپ بیتی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جِلد ۱۹۷۷ء اور دوسری ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اس آپ بیتی میں قرۃ

العین نے اپنے ارد گرد کے ماحول، خاندان، حالات اور موروثی عادات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی ادبی شخصیت کا نکھار کی وجہ قرار دیاہے۔ قرۃ العین نے خود اس آپ بیتی کو "سوانحی ناول" قرار دیاہے۔
اردو ادب کی مشہور اور نڈر مصنفہ عصمت چغتائی کی آپ بیتی "کاغذی ہے پیر ہن" بچپن کی یادوں اور خاندانی حالات پر مشتمل ہے۔ عصمت چغتائی نے اردو ادب میں اخلاقی قدروں کی پرواہ کیے بغیر افسانوی ادب تخلیق کیا۔ اگرچہ ایک بڑا طبقہ اُن کا مخالف تھا لیکن کسی کی پرواہ کیے بغیر انھوں نے زندگی کے حقائق کو اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش کیا۔ اُن کا یہ اندازِ اُن کی آپ بیتی میں نظر نہیں آتا۔ اُنھوں نے آپ بیتی میں اوّلیت اپنی ذات کی بجائے اپنے ماحول اور عہد کو دی ہے۔
امرتا پریتم کی آپ بیتی کا نام "رسیدی ٹکٹ" ہے۔ یہ اردو ترجمہ ہے۔ یہ واقعاتی نہیں بلکہ تاثراتی سوانحِ حیات ہے۔ "رسید ٹکٹ" میں ایک عورت کی بجائے ایک فنکارہ کا بیان زیادہ ہے۔ یہ آپ بیتی دو حِصوں میں شائع ہوئی۔ پہلا حصہ ۱۹۷۶ء میں "رسید ٹکٹ" اور دوسرا حِصہ ۱۹۷۷ء میں "لال دھاگے کا رشتہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ بعد میں دونوں حِصوں کا اکٹھا کر کے اسے "جنم جنم کی داستان" کا نام دے دیا گیا۔ امرتا پریتم کی آپ بیتی نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچادی۔ لوگوں نے کہا کہ امرتا کو یہ نہیں لکھنا چاہیے تھا لیکن امرتا نے منافقت سے اجتناب کر کے زندگی کے نشیب و فراز اور محوسات کو مِن و عَن بیان کر دیا۔ آپ بیتی میں امرتا کا بھرپور عکس موجود ہے۔ آپ بیتی کا سب سے چونکا دینے والا حِصہ وہ ہے جِس میں اس نے ساحر سے اپنے تعلقات اور محبت کے بارے میں لکھا ہے۔

بیسویں صدی کا آخری عشرہ اردو کے سوانحی نسائی، ادب کے لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس عرصے میں جو آپ بیتیاں منظرِ عام پر آئیں ان میں حمیدہ سالم کی "شورشِ دوراں" اور "ہم ساتھ تھے"، نفیس بانو شمع کی "جنت سے نکالی ہوئی حوّا" اور عذرا عباس کی "میرا بچپن" اہم اور دلچسپ ہیں۔ ان آپ بیتیوں کے مطالعے سے قارئین کو عورت کی نفسیات کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ ان آپ بیتیوں کے علاوہ حمیدہ اختر کی "ہم سفر" (۱۹۹۲ء) جس کا چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں چھپا، کشور ناہید کی "بُری عورت کی کتھا" (۱۹۹۴ء)، "شناسائیاں، رسوائیاں" ادا جعفری کی "جو رہی سو بے خبر رہی" جیسی مشہور آپ بیتیاں بھی قابلِ ذکر ہیں۔

آپ بیتیوں کی ان تمام اقسام کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ بیتی کسی بھی معاشرے کے فرد یا شخصیت کی ہو جب تک اس میں ادبی معیار موجود نہ ہو کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مجموعی لحاظ سے آپ بیتی کی صنف پر توجہ دی گئی۔ اپنے آغاز سے لے کر تاحال آپ بیتی کی صنف ارتقاء کی منازل طے کر رہی ہے۔ آپ بیتی کا فن در حقیقت صداقت، رنگارنگی اور تنوّع کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان اور بیان کی خوبیوں اور انداز اور بیان کے اعتبار سے ادباء اور شعراء کی آپ بیتیاں ہی سوانحی ادب کا حقیقی سرمایہ قرار دی جاسکتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ انور، قاضی صبیحہ (۱۹۸۲ء)، اردو میں خود نوشت سوانح حیات، لکھنؤ، نامی پریس، ص ۴۳

۲۔ ایضاً، ۴۵

۳۔ ایضاً، ۴۸

۴۔ ورک، اشفاق احمد (۲۰۰۵ء)، خاکہ اور خود نوشت، لاہور، بیت الحکمت، ص ۹

۵۔ ہاشمی، رفیع الدین (۲۰۰۸ء)، اصنافِ ادب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۱۶، ص ۱۶۶

۶۔ انصاری، یوسف جمال (۱۹۶۴ء)، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، مشمولہ: نقوشِ آپ بیتی نمبر، لاہور، ادارہ فروغِ اردو، ص ۷۸

۷۔ عبد القیوم (۲۰۰۷ء)، بحوالہ اردو نثر کا فنی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری (مرتب)، لاہور، الوقار، ص ۳۱۷

۸۔ قاضی، صبیحہ انور (۱۹۸۲ء)، اردو میں خود نوشت سوانح حیات، لکھنؤ، نامی پریس، ص ۱۹

۹. Abraham, M.H (1999) A Glossary of Literary Term, USA, Eavi Mcpeek, P, 22

۱۰. Lejeune, P (1989) On autobiography (Katherine of Minnesota Press، P: 04

۱۱۔ جین، گیان چند (۱۹۸۹ء)، ادبی اصناف، گجرات، اردو اکادمی ص ۱۳۸

۱۲۔ علوی، وہاج الدّین (۱۹۸۹)، اردو خود نوشت فن و تجزیہ، نئی دہلی، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، ص ۴۱

۱۳۔ بانو، مسرت (۲۰۱۴ء)، پاکستانی ادباء کی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں تاریخی اور تہذیبی شعور (۱۹۴۷ء تا حال) غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، سرگودھا یونیورسٹی ص ۵۰

۱۴۔ فریدی، قمر الہدی (۲۰۱۰ء)، خود نوشت: محرکات اور فنی تقاضے، مشمولہ: نئی کتاب (۱۴) نئی دہلی ص ۴۰

۱۵۔ ہاشمی، رفیع الدین، (۱۹۹۱)، اصناف ادب، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۱۶۶

۱۶۔ نیّر، ناصر عباس (۲۰۱۵ء)، یادوں کی برات نفسیاتی تناظر میں، مشمولہ: سہ ماہی، (شمارہ ۲۹۰) بنگلور کرناٹک اردو اکادمی، ص ۱۳

۱۷۔ جمال، نجیب (۱۹۹۵ء)، اردو خود نوشت کی انقلابی جہت، مشمولہ: کتاب کے بعد، لاہور، اظہار سنز، ص ۵۶

۱۸۔ طفیل، محمد (۱۹۶۴)، تفریحات، مشمولہ: نقوش آپ بیتی نمبر، لاہور، ص ۷

۱۹۔ ندوی، ابوالحسن علی(۱۹۹۶ء)، آپ بیتی مولانا عبدالماجد دریا آبادی (پیش لفظ)، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ص٦

۲۰۔ عبداللہ، سیّد(۲۰۰۷ء)، اردو میں آپ بیتی، مشمولہ: اردو نثر کا فنی ارتقاء، از فرمان فتح پوری (مرتب) لاہور، الوقار، ص ۲۵۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۵۲

۲۲۔ عبداللہ، سیّد (۱۹۶۴ء)، آپ بیتی، مشمولہ: نقوشِ ادب آپ بیتی نمبر، لاہور، ادارہ فروغ اردو، ص ۶۱

۲۳۔ مہر، غلام رسول، (۱۹۶۴ء)، آپ بیتیوں کی اہمیت، مشمولہ: آپ بیتی نمبر لاہور ۳۸

۲۴۔ ندوی، ابوالحسن علی، آپ بیتی از مولانا عبدالماجد دریا آبادی (پیش لفظ)، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ص ۷

۲۵۔ پروازی، پرویز، (۲۰۰۷ء)، پس نوشت اور پس، پسِ نوشت لاہور، نیازمانہ پبلی کیشنز ص ۲۴

۲۶۔ انور، قاضی صبیحہ، (۱۹۸۲ء)، محولہ بالا، ص ۳۴۸

۲۷۔ عبداللہ، سید، (۲۰۰۳ء)، وجہی سے عبدالحق تک، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز ص ۳۰۲ء

۲۸۔ عبداللہ، سید، (۲۰۰۴ء)، محولا بالا، ص ۳۰۲ء

۲۹۔ شاہ علی، سیّد، (۱۹۶۱ء)، اردو میں سوانح نگاری، دہلی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس ص ۳۰

۳۰۔ عبداللہ، سیّد، (۲۰۰۳ء)، اردو میں آپ بیتی، مشمولہ: اردو ادب کی فنی تاریخ، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ص ۳۵۹

31۔ احمد، ندیم (۲۰۰۲ء)، بیسویں صدی میں خود نوشت سوانح عمری، مشمولہ: خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ، شمارہ ۱۲۹، ص ۱۱۳

32۔ ریحانہ، خانم، (۱۹۶۴ء)، آپ بیتی کیا ہے، مشمولہ: آپ بیتی نمبر، لاہور، ادارہ فروغِ اردو، (ص ۸٦)

33۔ ایضاً، (، ص ۸۷

34۔ خانم، ریحانہ، (۱۹۶۴ء)، فن آپ بیتی اور آپ بیتیاں "الذبیر" آپ بیتی نمبر، (ص ۱۳)

35۔ انصاری، یوسف جمال، (۱۹۶۴ء)، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، مشمولہ: نقوش (جِلد اوّل) آپ بیتی نمبر ص ۷۰

36۔Mrs.Burr مشمولہ اطہر قسیم (۲۰۰۷ء)، اردو ادب کی آپ بیتیاں۔ تحقیقی و تنقیدی جائزہ، اسلام آباد، نیشنل یونیوسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز ص ۳

۳۷۔ سالک، علم الدین، (۱۹۶۴ء)، آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو، مشمولہ: نقوش (جِلد اوّل) آپ بیتی نمبر، لاہور، ادارہ فروغِ اردو، ص ۵۴

۳۸۔ ایضاً، (۵۴)

۳۹۔ قسیم، اطہر (۲۰۰۷ء)، آپ بیتیاں تحقیقی و تنقیدی جائزہ، اسلام آباد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، مقالہ غیر مطبوعہ، ص ۴۹

۴۰۔ احمد، ندیم (۲۰۰۲ء)، بیسویں صدی میں خود نوشت سوانح عمری، مشمولہ: خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ، شمارہ ۱۲۹، ص ۱۱۳

۴۱۔ آزاد، ابو الکلام، (۱۹۹۰ء)، تذکرہ، مرتبہ مالک رام، دہلی، ساہینہ اکادمی، ص ۵

باب دوم

"گئے دنوں کا سراغ" از مظفر وارثی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

فصل اول

مظفر وارثی کی سوانح و شخصیت

تمہید:

مظفر وارثی کا ادبی سفر انیس سو ساٹھ کی دہائی سے شروع ہوتا ہے۔ آپ نامور شاعر اور نثر نگار تھے۔ شاعری میں غزل، گیت اور نعت اُن کی پہچان ہے جبکہ نثر میں اُنھوں نے کئی علمی و ادبی مضامین لکھے۔ پاکستان کے روزنامہ اخبار "نوائے وقت" کے لیے اُنھوں نے طویل عرصے تک حالاتِ حاضرہ پر قطعات لکھے۔ علمی و ادبی حلقوں کی طرف سے اُنھیں "لِسان العصر" کا لقب دیا گیا۔ مظفر وارثی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ قدرت نے انھیں جو شخصی خوبیاں عطا کی تھیں وہ کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ مظفر وارثی ایک خوش الحان شاعر تھے۔ جہاں اُن کی شاعری اپنے فلسفہ و اسلوب کی بدولت دِلوں میں سماتی تھی، وہیں اُن کی آواز سماعتوں میں شیرینی گھولتی تھی۔ اردو شاعری میں اپنے اسلوب اور پڑھنے کے انداز کی بدولت مظفر وارثی تادیر یاد رکھے جائیں گے۔

خاندانی پس منظر:

بھارت کے صوبہ اُتر پردیش کا ایک تاریخی شہر میرٹھ ہے جِس کا پُرانا نام "عشق آباد" تھا۔ یہ دہلی سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس خطے کے تاریخی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ میرٹھ کا اردو شاعری میں خاص کردار ہے۔ اردو کی ابتداء اور ارتقاء میں امیر خسروؒ پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کے نمونے ملتے ہیں۔ خسرو کے بعد جس شاعر کا نام لیا جاتا ہے وہ میرٹھ کے افضل جھنجھانوی کا ہے۔ (جھنجھانہ میرٹھ کا مضافاتی مقام ہے)۔ علامہ سحر آبادی فنِ عروض میں سند تسلیم کیے جاتے تھے، ان کا تعلق بھی میرٹھ سے ہی تھا اور ان کا زمانہ اورنگ زیب عالمگیر کا عہد ہے۔ اس طرح اردو ادب میں میرٹھ کو ادبی اوّلیت حاصل ہے۔ افضل جھنجھانوی کا ذکر میر حسن نے اپنے تذکرے میں بھی کیا ہے۔ جعفر زٹلی کا تعلق بھی میرٹھ ہی سے تھا۔ جعفر زٹلی اردو طنز و مزاح کے بانی اور ولی دکنی کے ہم عصروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

انگریزوں کی آمد کے بعد صحافتی دَور کے آغاز میں میرٹھ سے ایک اخبار "جامِ جمشید" شائع ہوا۔ یوں میرٹھ کو فنِ صحافت میں بھی امتیاز حاصل رہا۔ تذکرہ نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو نکات الشعراء سے شعر الہند تک جتنے تذکرے لکھے گئے، ان میں میرٹھ میں تحریر کردہ تذکرے "طبقات سخن" غلام محی الدّین عشق"، "گلشن بے خار"، "نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور بہارستان ناز" فصیح الدین رنج طیب قابلِ ذکر ہیں۔ میرٹھ شہر کو "دلی کا بچہ" بھی کہا جاتا ہے اِس لیے یہاں دلی کی طرح شاعروں کا بھی عام چلن تھا۔

میرٹھ میں، غلام محی الدین عشق کے مکان پر باقاعدگی سے طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے، جِن کے بیٹے مسرور اور پوتے امداد حسین ظہیر اپنے دَور کے قابلِ ذکر شاعر تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نہ صرف تذکرہ نگار بلکہ خوش گلو شاعر بھی تھے۔ شیفتہ اگرچہ غالب کے شاگرد تھے لیکن غالب کہتے ہیں کہ جب تک میں شیفتہ سے داد نہیں پا لیتا، دیوان میں شعر درج نہیں کرتا۔ (شیفتہ کی اولاد میں اسماعیل میرٹھی نے بچوں کی شاعری کے حوالے سے ملک گیر شہرت پائی)۔

لاہور اور دلی کی طرح، میرٹھ کا قدیم شہر بھی دروازوں پر محیط ہے۔ شاہ پیر دروازہ، شوراب گیٹ، بڑھانہ گیٹ، باغپت دروازہ اور دلّی دروازہ اہم ہیں۔ پُرانی روایت کے مطابق ہر دروازے کے ساتھ پولیس تھانہ موجود ہے۔ شوراب گیٹ اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ اسی دروازے سے سرائے بہلم جاتے ہیں۔ جہاں مظفر وارثی کی پیدائش ہوئی۔ مظفر وارثی کا سلسلہ نسب ۳۷ویں پشت میں سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاملتا ہے۔ پانچ یا چھ پشت پہلے کے جدِ امجد میرٹھ سے نو کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں علی پور سے آکر میرٹھ آباد ہو گئے تھے۔

پیدائش:

۲۳ دسمبر ۱۹۳۳ء کو صبح سویرے میرٹھ شہر کے محلہ سرائے بہلم میں مسجد کے سامنے جِس دو منزلہ مکان میں مظفر پیدا ہوئے اس کے نچلے حِصے میں بیٹھک کے علاوہ روزنامہ "عالمگیر" اور ماہنامہ "خیال" کا دفتر بھی تھا۔ مظفر وارثی آٹھ بہنوں کے بعد پہلی اولادِ نرینہ تھے۔ خود نوشت "گئے دِنوں کا سُراغ" جو ۲۰۰۰ء میں طبع ہوئی. اس میں وارثی (۱) لکھتے ہیں:-

"ہم آٹھ لڑکیوں کے بعد پہلی اولادِ نرینہ تھے۔ ستواسے بھی تھے اور دایہ کو بھی زحمت نہیں دی تھی، کتنی جلدی تھی صعوبتوں سے کھیلنے کی، یہ کھلونے اداس تھے ہمارے بغیر۔ کسے خبر تھی اتنی تنہائی میں پیدا ہونے والا بچہ ایک دن دنیا بھر کی خاک چھانے گا۔ تین بہنیں ہماری آمد کے وقت موجود تھیں باقیوں کو زمیں نے کھالیا تھا۔"

مظفر وارثی کی جائے پیدائش کا علاقہ بارونق ہے۔ اناج منڈی اور گھنٹہ گھر کے درمیان ویلی بازار ہے۔ نیچے دکانیں ہیں اور اُوپر طوائفوں کے کوٹھے۔ ایک بازار نیچے ہے جو دن کو اور ایک بازار اُوپر جو رات کو کُھلتا ہے۔ طوائف تمیزن کے قتل کا مشہور واقعہ بھی یہیں کا ہے جِس کا اجمال کچھ یوں ہے کہ ایک نواب صاحب تمیزن کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ نکاح کے بعد اُسے گھر لے آئے لیکن نِباہ نہ ہو سکا اور بالآخر نواب صاحب کو طوائف کے خون سے ہاتھ رنگ کر اپنی غلطی کی قیمت چُکانا پڑی۔ شہر سے باہر ایک وسیع و عریض میدان ہے جس کے پہلو میں "بالے میاں قبرستان" ہے جہاں مظفر وارثی کے آباؤ اجداد دفن تھے، بعد میں ہندوؤں نے اسے برابر کر دیا۔ اس میدان میں داخل ہونے کے لیے مغلیہ طرز کا ایک قد آور دروازہ ہے جسے نوچندی دروازہ کہتے ہیں۔ ہر سال اس میدان میں "نوچندی" کے نام سے منظم اور باوقار میلہ لگتا ہے۔ ایک ماہ تک رہنے والے اس میلے میں ہمیشہ ایک دن شاعری کے لیے مختص ہوتا ہے۔ وارثی (۲) کہتے ہیں:-

"سب سے پہلا مشاعرہ ہم نے وہیں پڑھا تھا۔ والد صاحب نے چند اشعار لکھ کر دیے تھے۔ جگرؔ، سیمابؔ، نوح ناروی، ہر چند اختر اور بہت سے انڈین شعراء کو پہلی بار ہم نے وہیں دیکھا تھا۔"

آباؤ اجداد اور والدین:

مظفر وارثی کے دادا محمد علاؤ الدین احمد صدیقی میرٹھ شہر کے رئیسوں میں سے تھے۔ وہ "شاکر" تخلص کرتے تھے اور نظم کے علاوہ نثر بھی لکھتے تھے۔ اپنی وفات کے وقت انھوں نے ذاتی رہائش کی حویلی کے علاوہ اکیس مکان، چھاپے خانہ اور ایک بڑی کتابوں کی دکان چھوڑی۔ وہ بیک وقت کُتب فروش اور ناشر تھے۔ کتابوں کا کاروبار اُن کے والد اور مظفر وارثی کے پر دادا شیخ امین الدین الحمد نے شروع کیا تھا۔ شیخ امین الدین کا زیادہ وقت کتب خانے

میں گزرتا۔ ہمہ وقت بیٹھے رہنے سے وہ ذیابیطس جیسی موذی بیماری کا شکار ہو گئے۔ اس زمانے میں بنک میں جمع پونجی رکھنے کا رواج نہ تھا چنانچہ طلائی اشرفیوں کی شکل میں انھوں نے کافی دولت زمین کی تجوری میں رکھی ہوئی تھی۔ مرض نے شدت اختیار کی تو اشاروں کنایوں میں بھی بات نہیں کر سکتے تھے لہٰذا آخر تک کسی کو دفینے کا پتہ نہ بتا سکے اور حملے کے تین دن بعد ۵۸ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیّک کہا۔ وارثی (۳) لکھتے ہیں:-

"فالج ان پر نہیں ان کے اکلوتے بیٹے کے مستقبل پر پڑا تھا۔"

مظفر وارثی کے والد علامہ صوفی وارثی میرٹھی کا اصل نام شرف الدّین احمد صدیقی تھا۔ مظفر وارثی کے بقول دادا جان اپنے بیٹے محمد شرف الدّین احمد کو "پوتڑوں کا رئیس" کہا کرتے تھے جو تین بیٹوں کے بعد پیدا ہوئے۔ اُن کی ساری تعلیم گھر پر ہوئی۔ اتالیق پڑھانے آتے۔

صوفیاء کے چاروں سلسلے چشتی، قادری، سہروردی اور نقشبندی اُن کے راہنما ٹھہرے۔ ۱۹۰۰ء میں خانہ کعبہ اور روضہ رسول ﷺ پر گئے اور شیخ سنوسی سے بیعت اور تربیت حاصل کی۔ اُن کی زندگی معجزات سے بھری ہوئی ہے۔ جِن اُن کے قبضے میں تھے اور وہ جِن اُتارا بھی کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کی کئی جہات تھیں۔ وہ شاعر، صوفی، درویش، خطیب اور طبیب تھے۔ اُنھیں "فصیح الہند" اور "شرف الشعراء" کا خطاب دیا گیا تھا۔ نوح ناروی سے تلمذ حاصل تھا۔ یہ وہی نوح ناروی ہیں جو دلی کے ایک تاریخی مشاعرے میں حاصلِ مشاعرہ رہے۔ اس طرحی مشاعرے میں ان کی غزل کا مطلع تھا

ے شرط یہ تھی کہ تماشا نہ بنایا ہوتا
پھر مجھے شوق سے دیوانہ بنایا ہوتا

اس کامیابی پر دلی کی گراموفون کمپنی نے ان کی سات غزلیں ریکارڈر کیں جن میں ایک غزل کا شعر کا یہ ہے

ے میرا ہاتھ دیکھ برہمنا، میرا یار مجھ سے ملے گا کب
ترے مُنھ سے نکلے خدا کرے اسی ماہ میں اسی سال میں

صوفی وارثی اشرف الدین کے معاصرین میں علامہ اقبال کے علاوہ، اکبر الہ آبادی، ریاض خیر آبادی، شجاع الدّنیا تاباں، احسن مارہروی، سیماب اکبر آبادی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، احسان دانش، ہری چند اختر، سراج

الدین ظفرؔ، مولانا حسین احمد مدنی، خواجہ حسن نظامی، بے خود دہلوی، مولانا عبدالحلیم صدیقی اور جگر مراد آبادی شامل تھے۔

شرف الدین نے چار شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کو طلاق دے دی گئی اور دوسری اور تیسری اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ تیسری بیوی سے ایک لڑکا محمد مظہر الدین اور ایک لڑکی قیصر جہاں تھی۔ قیصر جہاں جوانی میں ہی فوت ہو گئی جبکہ مظہر الدین احمد ٹیلی فون کے محکمے میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ان کا کراچی میں انتقال ہوا۔

مظفر وارثی کی والدہ ان کے والد کی چوتھی شریکِ حیات تھیں جن سے آٹھ لڑکیاں اور ایک لڑکا مظفر وارثی تھا۔ تین لڑکیاں زندہ تھی باقی بچپن میں ہی وفات پا گئی تھیں۔ آپ کے والد ۱۷ دسمبر ۱۹۶۲ء کو وہ مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ مظفر وارثی کی والدہ کا نام کنیز فاطمہ تھا جنھیں وہ "آپا جی" کہتے تھے۔ آپا جی وادی سوات کے ایک سیّد زادے فضل الٰہی شاہ کی بیٹی تھیں۔ وہ ایک شوہر پرست خاتون اور صبر و رضا کا پیکر تھیں۔ انھوں نے ساری زندگی اپنے شوہر کو کبھی "تم" کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ وارثی (۴) لکھتے ہیں:-

> "ماں تو سب کی اولاد پر جان دیتی ہے لیکن ہماری ماں بہت ہی جنتی تھی، ان میں تو ممتا اور صبر کے سوا تھا ہی کچھ نہیں۔ اتنی سیدھی خاتون ہم نے زندگی میں نہیں دیکھی ۔وہ ہمیشہ ہمیں بھیّا کہہ کر بلاتیں۔ کبھی نام سے نہیں پکارا۔"

وہ ہر حالت میں گزارا کرنے والی خاتون تھیں۔ پاکستان آنے کے بعد بارہ تیرہ سال وہ ٹھیک رہیں لیکن پھر بیمار ہو گئیں۔ ڈاکٹروں نے آپریشن بتایا لیکن اُن کی صحت آپریشن کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ بالآخر وہ جنوری ۱۹۷۱ء میں وفات پا گئیں۔

بچپن اور تعلیم:

وارثی کے بچپن کے حالات کے بارے میں ان کی خودنوشت "گئے دنوں کا سراغ" ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہوا ہے کہ ابھی ان کی عمر ایک سال کی بھی نہیں تھی کہ ان کے کان کے نیچے پھوڑا نکل آیا۔ اس زمانے میں آپریشن کا

نام لینا بھی منحوس سمجھا جاتا تھا لیکن وارثی کو ان کے والد نے ایک ہندو سرجن کے حوالے کر دیا اور کہا کہ ان کی زندگی لے لو لیکن ان کے بیٹے کی جان کی جان بچا لو۔

وہ کہتے ہیں کہ ابا میاں مجھے مولوی بنانا چاہتے تھے۔ آپا جی ہمیں بابو بنانا چاہتی تھیں۔ جبار بلڈنگ کے سامنے ایک پرائمری سکول تھا جہاں دو سال پڑھتا رہا۔ تیسری جماعت لالہ کے بازار والے سکول میں پڑھی۔ بچپن میں کبڈی بھی کھیلی۔ مٹی کے کھلونے بنا کر کھیلتا رہا، لیکن ابا جی کو مٹی سے کھیلنا ناپسند تھا۔ وہ غصے کے تیز تھے، اگر کبھی دیکھ لیتے تو تھپڑوں پر ہی اکتفا نہ کرتے بلکہ سالم اُٹھا کر دیوار سے دے مارتے تھے۔ وارثی (۵) لکھتے ہیں:-

"آپا جی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے سامنے اُف بھی کر تیں۔ بچپن کی یہ مار ہمارے بہت کام آئی۔ دنیا نے ہمیں اُٹھا کر پٹخا، ہم پھر سے کپڑے جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔"

اپنے ماں باپ کے بارے میں وارثی (٦) رقم طراز ہیں:--

"ہمارے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے ہم اپنی ماں کی محبتوں اور صبر کا احاطہ کر سکیں۔ ماں اتنی صابر، باپ ایسا قلندر اور ہم دونوں کے خون کا مجموعہ، اس وقت تو ہم دونوں کے بالکل الٹ تھے لیکن آہستہ آہستہ حالات نے صبر اور قناعت بھی سکھا دی۔"

۱۹۴۷ء کے آس پاس فیض عام انٹر کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ چھٹی جماعت سے بارہویں تک تھا۔ اس کالج سے انتظار حسین، سلیم احمد، ڈاکٹر جمیل احمد جالبی اور احمد حمدانی نے بھی تعلیم حاصل کی۔ ہجرت کے بعد ڈیڑھ پونے دو سال کسی سکول میں داخلہ نہ ملا پھر مولانا ہارون الرّشید ارشد کی کوششوں سے مسلم ماڈل ہائی سکول اردو بازار میں ٹیسٹ لے کر ساتویں جماعت میں داخل کیا گیا۔ اس ضمن میں وارثی (۷) قلم آرا ہیں:-

"کتابوں کے لیے کسی نے بتایا مسلم لیگ کی مدد حاصل کریں۔ لکشمی بلڈنگ میکلوڈ روڈ پر لیگ کا دفتر تھا، کئی دن وہاں جاتے رہے، لائن میں لگ کر سیکرٹری جنرل یامین خاں کی لاتیں بھی کھاتے رہے۔ یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔

کتابیں مل گئیں۔ کاپیاں پینسلیں خواجہ دل محمد اپنے بیٹے خواجہ گلزار سے دلا دیا کرتے تھے۔"

وہ بتاتے ہیں کہ خواجہ دل محمد میرے والد کے دوست تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ زیادہ دیر اس آزمائش سے نہیں گزرنا پڑا اور مسلسل اچھی پوزیشن لانے پر ۷۵ روپے ماہوار سالانہ وظیفہ اور کتابیں سکول سے ملنے لگیں۔ نہم جماعت تک پہلی پوزیشن لیتے رہے۔ میٹرک کے لیے سہ ماہی ٹیسٹ لیا جاتا تھا جس میں زیادہ اچھے نمبر نہ آئے تو انھوں نے پرائیویٹ داخلہ بھیج دیا۔ گھر والے ایک ایک دن انگلیوں پر گِن رہے تھے کب میٹرک ہو اور ملازمت ملے۔ اِدھر انھوں نے مزدوری کے چکر میں پڑھائی کا ستیاناس کر لیا۔ بہر حال خدا خدا کر کے امتحان میں پاس ہوئے۔ اس کے بعد پرائیویٹ تعلیم جاری رکھی اور انٹر اور ادیب فاضل کیا۔

ہجرت:

مظفر وارثی کے والد صوفی وارثی میرٹھی کا تعلق " جمیعت العلمائے ہند" سے تھا اور ان کی ہمدردیاں کانگریس کے ساتھ تھیں۔ پاکستان بنا تھا مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈر قید کر دیے گئے۔ چونکہ حکومت صوفی وارثی کو کانگریسی سمجھتی تھی اس لیے اُن کو کہا گیا کہ "ہم آپ کو جیل بھیجنا چاہتے ہیں" مقصد یہ تھا کہ یہ جیل جا کر مسلم لیگ کے رہنماؤں کی معاوضہ لے کر جاسوسی کریں۔ اس بات پر صوفی وارثی سیخ پا ہو گئے۔ حکمران طبقے سے دو تین ہفتے کی مہلت لے کر چند ہی دنوں میں گھر کی ساری چیزیں بیچ ڈالیں اور پاکستان کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اس قافلے میں ان کی بڑی بیٹی، داماد، مظفر وارثی کے بڑے ماموں کا خاندان اور ان کی باجی کے سسرالی رشتے دار بھی تھے۔ نصف شب کے قریب یہ لوگ ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ ٹرنک اور بستر ان کے ہمراہ تھے۔ ٹرنک بُک کر دیے گئے۔ سامان چلا گیا لیکن بوجہ رش یہ لوگ نہ جا سکے۔ اگلی کوشش میں ملٹری قافلہ جو سات ٹرکوں پر مشتمل تھا اس کا انتظام کیا گیا۔ یوں یہ لوگ اگلے دن سہارن پور پہنچ گئے۔

سہارن پور ریلوے اسٹیشن پر ہر طرف کشت وخون کا بازار گرم تھا۔ شہر سے کافی دور میدان میں مہاجر کیمپ لگا ہوا تھا وہاں لا کر ان کو چھوڑ دیا گیا۔ دو کمبل تان کر خیمہ بنایا گیا اور تیرہ دن وہاں قیام رہا۔ چودھویں دن ۲۴ نومبر ۱۹۴۷ء کو پٹڑی پر سپیشل ٹرین کی نوید سُنائی گئی۔ صبح سویرے سے ہی لوگ مطلوبہ جگہ پر جمع ہونے لگے۔ ٹرین دوپہر تک آئی اور لوگ پاگلوں کی طرح دوڑ دوڑ کر اس میں سوار ہوتے گئے۔ بستر چھت پر کسی کے حوالے کر دیے گئے اور خود یہ سب لوگ بمشکل سوار ہوئے۔ مظفر وارثی نے اپنی آپ بیتی "گئے دِنوں کا سُراغ" میں بہت باریکی سے ہجرت

کے آنکھوں دیکھے واقعات لکھے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ چند گھنٹوں کا سفر ایک دن اور دو راتوں میں طے ہوا۔ دوسری شام مغرب کے وقت انڈیا کے سرحدی سٹیشن "اٹاری" پر گاڑی پہنچی۔ وہ(۸) لکھتے ہیں:-

> "راستے میں دیکھی ہوئی اَن گنت لاشیں آنکھوں میں تیر رہی تھیں۔ دوسرے دن کے سورج کی طرح نبض بھی ڈوب رہی تھیں۔ کئی گھنٹے روح فرسا انتظار کے بعد پاکستانی فوج اور انجن آیا اور ادھر پہیے چلے اور ادھر گولیاں۔"

موت کی برسات میں سے ٹرین مغل پورہ اسٹیشن پہنچی۔ پاکستان زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ مغل پورہ اسٹیشن پر پہنچتے ہی لیٹنے کو جی چاہتا تھا۔ بستر لینے گئے تو وہاں بستر تھے نہ بستروں کا محافظ۔ ابا میاں نے یہ خبر سُنی تو کھڑے سے گر گئے۔ کیونکہ جو کچھ روپیہ زیور تھا وہ تکیوں کے اندر تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کو اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ تھا پاکستان کی سرزمین سے پہلا تعارف۔ اس خاندان نے بوتلوں کے ایک کارخانے میں تین دن گزارے۔ بوریاں ہی اوڑھی اور بچھائی جاتیں۔ وہاں سے صوفی وارثی کے مریدِ خاص حمید وارثی اس خاندان کو لنڈے بازار اپنے چھوٹے سے مکان میں لے گئے اور اوپر کا حِصہ انھیں دے دیا۔ حمید وارثی تمباکو کا کاروبار کرتے تھے۔ انھوں نے مظفر وارثی کے بہنوئی کو اپنے ساتھ کاروبار میں لگالیا۔ وارثی(۹) اس سب صورتِ احوال کا حال لکھتے ہوئے کہتے ہیں:-

> "آپا جی کا دُور پرے کا رشتے دار آلِ حسن خدا جانے کہاں سے آگیا اور ابا میاں جی کو پٹی پڑھانے لگا۔ خالو میاں کب تک آپ اس چھوٹے سے کمرے میں رہیں گے میرے ساتھ چلیں ہندوؤں کے سینکڑوں مکان بند پڑے ہیں کسی ایک کا تالا توڑ کر اندر گھس جائیں گے۔ ہو بھی یہی رہا تھا، لوگ تالا ایک گھر کا توڑتے سامان کئی گھروں کا اندر ہی اندر سمیٹ لاتے۔"

مظفرؔ وارثی بتاتے ہیں کہ اس بات پر ابا میاں آلِ حسن پر ناراض ہوئے۔ کافی رد و کد کے بعد بالآخر رام گلی میں تین منزلہ چھوٹا سا مکان الاٹ ہوا۔ رام گلی کا مکان کسی لوہار کا تھا۔ تھوڑا سا لوہا اور ایک لوہے کہ پڑچھتی یہاں کا کل مال غنیمت تھا۔ پڑچھتی کی ٹانگیں اُٹھا کر چارپائی بنالی گئی۔ نیچے والی منزل میں صوفی وارثی نے اپنی بیٹھک بنالی۔ پہلی منزل میں ایک واقف کار، دوسری منزل میں ہمشیرہ اور تیسری منزل میں مظفر وارثی اپنی بہنوں اور والدہ کے ساتھ رہنے لگے۔

شعر گوئی:

میرٹھ ہندوستان میں جبار بلڈنگ کے سامنے والے شاعروں میں مظفر وارثی لڑکپن سے ہی اپنے والد کی شاعری پڑھا کرتے تھے۔ پاکستان میں پہلی عید والے دن صوفی وارثی اور مظفر وارثی نے شاہی مسجد میں دس بارہ نمازیوں کے پیروں تلے کُچلے جانے کی منظم رُوداد کو دو ورقوں پر چھپوایا اور گا گا کر بیچا۔ میٹرک میں کسی صاحب نے اپنی فلم میں مظفر وارثی سے گیت لکھوانے کا وعدہ کر لیا جِس سے اِن کی پڑھائی بھی خراب ہوئی۔ وہ بتاتے ہیں کہ یونیورسٹی کا مشاعرہ میری زندگی کا پہلا مشاعرہ تھا۔ اسی کی بدولت ہی مجھے اسٹیٹ بنک میں ملازمت ملی۔ مغل پورے کے مشاعروں میں میرے والد صوفی وارثی میرٹھی اور میں پیدل جایا کرتے تھے۔ مشاعرے کا معاوضہ تین روپے ملتا جس سے دو وقت کی دال روٹی مل جاتی۔ اِنھی دِنوں کا واقعہ سناتے ہوئے مظفر وارثی کہتے ہیں کہ ہمارے ابا میاں کے ایک دوست اپنی نو عمر صاحب زادی کے ساتھ دس بارہ دن ہمارے ہاں مہمان ہوئے۔ تاج نامی یہ لڑکی بلا کی حسین تھی۔ تاج اور مظفر کے درمیان اَن دیکھا تعلق بن گیا۔ جب وہ جا رہی تھی تو جدائی کی کیفیت نے اِن کے اندر جِلا بخشی۔ کچھ ہی دِنوں بعد مغل پورے مشاعرے کا دعوت نامہ آیا جس کا طرح مصرع "یہ جہاں ہے آئینہ، یہ زندگی تصویر ہے" مظفر وارثی بتاتے ہیں کہ میں نے ابا میاں کی بیاص کھنگالی تو اس زمین میں ایک غزل نکل آئی اور میں نے اسے سامنے رکھ کر اور ذہن میں تاج کا تصور بسا کر کتنے ہی شعر کہہ ڈالے۔ وہ (۱۰) کہتے ہیں:-

> "تاج سے ملاقات اور جدائی شاید اسی لیے برپا ہوئی تھی۔ ہم نے ایک شعر
> ابا کا ایک اپنا رکھ کر غزل تیار کی اور مشاعرے میں جا پہنچے۔"

وہ بتاتے ہیں کہ مشاعرے میں جب غزل پڑھی تو اباجی کے شعر پر داد ملی۔ مقطع میرا اپنا کہا ہوا تھا اور اس میں شعریت نہیں حقیقت تھی اس لیے اس پر بے انتہا داد ملی۔ وہ شعر (۱۱) تھا

ے اے مظفرؔ قول سے اپنے وہ پھر سکتے نہیں
کیونکہ میرے پاس ان کے ہاتھ کی تحریر ہے

مشاعرے سے آ کر بقول مظفر وارثی انھوں نے وہ غزل ابا میاں کی فائل میں رکھ دی۔ جب ان کی نظر سے گزری تو وہ چونکے اور عِلم ہونے پر اُنھوں نے شعر گوئی کی تعریف اور حوصلہ افزائی کی۔ دو سال تک اصلاح کرتے رہے بعد ازاں کہا کہ خود ہی نظر ثانی کر لیا کرو۔ مظفر وارثی کہتے ہیں کہ وہ کتاب تو خرید نہیں سکتے تھے، ان دنوں بی

این آر سنٹر اور پنجاب لائبریری میں جا کر مطالعہ کرتے اور نئے پُرانے سب شعراء اور ادباء کا مطالعہ کیا جس سے تحریر اور تقریر میں بہتری آئی۔ باپ اور بیٹے کی شاعری میں فرق دیکھ کر لوگ بھی مجھے تسلیم کرنے لگے۔

غزل، نظم، حمد و نعت، سلام و منقبت اور قطعات ان کی خاص اصناف تھیں۔ بنیادی طور پر غزل گو ہیں لیکن کئی فلموں کے گیت بھی لکھے۔ نعت گوئی شروع کی تو گیت نگاری کو خیر باد کہہ دیا۔

مظفر وارثی شعر کو خوش الحانی اور ترنم سے پڑھتے تھے۔ اچھے اشعار مشاعروں میں جب ترنم کے ساتھ پڑھے جاتے تو شاعری کا حُسن و آتشہ ہو جاتا۔

رشتہ ازدواج:

"تاج" تو گویا مظفر وارثی کو دریافت کرنے آئی تھی۔ ہنوز مظفر وارثی کنوارے تھے۔ ۱۹۵۷ء میں انھیں ٹی بی ہو گئی اور ہسپتال داخل کرا دیا گیا۔ وہاں سے ٹھیک ہو کر نکلے تو روحانی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے۔ والدہ نے کہا کہ جیسے تمھارے والد تمھاری شادی کا ارمان لیے اس دنیا سے چلے گئے، ایسے میں بھی ایک دن چلی جاؤں گی۔ اس موقع پر مظفر وارثی نے اپنی والدہ کو شادی کے لیے رضامندی دے دی۔ یوں یکم مارچ ۱۹۶۴ء کو ہاشمی بیگم ان کی زندگی میں شریکِ حیات بن کر شامل ہو گئیں۔ مشہور شاعر سیف زلفی نے ان کا سہرا پڑھا۔

انتہائی ناگفتہ بہ حالات کے باوجود ہاشمی بیگم کا طرزِ عمل ایسا تھا جیسے وہ شیش محل میں رہتی ہوں۔ اس گھر میں آ کر جب اُنھیں پتہ چلا کہ شادی کے لیے قرض لیا گیا تھا تو انھوں نے دونوں طرف کا زیور بنک میں گروی رکھ کر قرض ادا کیا۔ اُن کے ہاں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہوا۔ تمام اولاد نیک اور سعادت مند ثابت ہوئی جسے مظفر وارثی نے اعلیٰ تعلیم دلائی۔

ذریعہ روزگار:

لاہور میں دیال سنگھ کالج کی طرف جاتے ہوئے دل محمد روڈ سے گزر ہوتا ہے۔ خواجہ دل محمد مظفر وارثی کے والد کے دوست تھے۔ معروف ماہرِ تعلیم اور شاعر خواجہ دل محمد کی نصابی کتابیں اس دور میں مستند اور معیاری سمجھی جاتی تھیں اور یہ میٹرک تک کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اُن کے بارے میں وارثی (۱۲) کہتے ہیں:-

"ایک دن ہم نے ان سے پوچھ ہی لیا خواجہ صاحب! آپ ہمیں اتنا کیوں
چاہتے ہیں؟ ابا میاں جی اور کئی دوسرے اصحاب ہمارے اس سوال پر حیران

> رہ گئے۔ بڑی لجاجت سے ہماری ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر فرمایا: آپ اتنے اچھے شعر کیوں کہتے ہیں؟ یہ پہلی سند تھی جو ایک بے لوث انسان سے ہمیں ملی۔"

پنجاب یونیورسٹی ہال میں ایک کل پاک وہند مشاعرہ رکھا گیا جس کے پوسٹروں میں پہلی بار مظفر وارثی کا نام بھی لکھوایا گیا۔ یہ ایک یادگار مشاعرہ تھا جس میں جگر مراد آبادی، ہری چند اختر، جگن ناتھ آزاد، وحشت کلکتوی اور دیگر کئی شعراء نے شرکت کی۔ قدرت مظفر وارثی پر مہربان تھی۔ مشاعرے کے اختتام پر سامعین کی اگلی صف میں بیٹھے سیّد رشید احمد بخاری (جو دِلّی کی جامع مسجد کے امام بخاری کے چھوٹے بھائی تھے اور اسٹیٹ بنک آف پاکستان لاہور میں کیش ڈیپارٹمنٹ کے انچارج تھے) نے مظفر وارثی سے پوچھا کہ کیا کرتے ہو۔ اِنھوں نے ازراہِ تفنّن کہا اِکسٹھ باسٹھ، تو اُنھوں نے کہا، "کیا ملازمت کروگے؟" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اُنھوں نے پانچ سو روپے کیش سکیورٹی اور پینتیس ہزار کی شخصی ضمانت کا بندوبست کرنے کا کہا۔ پاس تو کچھ نہ تھا۔ ابّا میاں سے بات کی گئی تو وہ نکڑ کے پرچون فروش مصطفیٰ کے پاس گئے اور سارا معاملہ کہا۔ مصطفیٰ نے پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا، "جب آپ کے پاس ہوں دے دیجیے گا۔" پانچ سو کا انتظام ہو گیا لیکن پینتیس ہزار کی شخصی ضمانت ابھی باقی تھی۔ ابا جی کے کہنے پر مظفر وارثی خواجہ دل محمد کے پاس گئے اور مدعا بیان کیا۔ خواجہ دل محمد نے جائیداد کے کاغذ لیے اور اپنی کار میں بٹھا کر اسٹیٹ بنک جا پہنچے۔ وہاں نصیب بٹ سے ضمانت دلوائی۔ اس بابت "گئے دِنوں کا سُراغ" میں (۱۳) فرماتے ہیں:-

> "ہم نے بخاری صاحب سے ان کا تعارف کرایا۔ بخاری صاحب نے ازراہِ مذاق کہا: خواجہ صاحب! آپ ضمانت تو دینے آگئے ہیں، مظفر وارثی کو اچھی طرح جانتے بھی ہیں۔ کیش کا معاملہ ہے۔ خواجہ صاحب کے بھتیجے بھی بنک میں آفیسر تھے۔ بخاری صاحب سے کہہ کر خواجہ صاحب نے اُنھیں بلوایا اور ان سے کہا نصیب بٹ! "تم مظفر وارثی کو جانتے ہو؟" اُنھوں نے کہا نہیں، "تو پھر پراپرٹی کے کاغذات لے آؤ ان کی ضمانت دینی ہے۔" مذاق بخاری صاحب کے حلق میں پھنس گیا۔ لاکھ کہا کہ میں مذاق کر رہا تھا لیکن خواجہ صاحب نے ایک نہ مانی اور ہماری ضمانت نصیب بٹ نے دی۔"

ضروری کاروائی کے بعد مظفر وارثی کو ملازمت مل گئی۔ اسٹیٹ بنک کی ملازمت کا یہ عرصہ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۸۹ء پر محیط ہے۔ اس دوران ۱۹۸۱ء میں انھوں نے عمرے کی سعادت حاصل کی۔

شخصی خصائل:

بہت سی باتیں تو خاندانی پسِ منظر، بچپن اور شعر گوئی کے ضمن میں درج کی جاچکی ہیں اس کے علاوہ مظفر وارثی شطرنج کے ماہر تھے جب ابھی ملازمت نہیں ملی تھی یہ انارکلی میں بخشی مارکیٹ کے پیچھے والے شطرنج خانے میں چلے جایا کرتے۔ اپنے والد صاحب کی بدولت وہ اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ اکثر لوگ کہتے تھے کہ یہ تاریخ کا ورلڈ چیمپئین بنے گا لیکن ملازمت اور شعر گوئی کی بدولت اُن کا دل شطرنج سے اچاٹ ہو گیا۔ شاعری اور شطرنج دونوں ہمہ وقتی شوق تھے۔ بالآخر شاعری نے اُنھیں اور اُنھوں نے شاعری کو چُن لیا۔

۱۹۸۹ء میں "پاکستان عوامی تحریک " میں شامل ہوئے لیکن بہت جلد اسے چھوڑ دیا۔ مظفر وارثی کے پاس بہت سے لڑکے اور لڑکیاں شاعری کا شوق لے کر آتے تھے لیکن وہ تخلیقات دیکھنے سے پہلے ہی کہہ دیتے تھے کہ اگر کلام موزوں ہوا تو اصلاح کروں گا ورنہ معذرت قبول کیجیے۔ ۱۹۴۹ء میں شاعری شروع کرنے والے مظفر وارثی کم و بیش پچاس ہزار اشعار کہہ چکے ہیں۔ سینکڑوں غزلیں اُنھوں نے معیار سے کم سمجھ کر ضائع کیں۔

کھانے میں اُنھیں کڑھی، کوفتے، کریلے اور پائے مرغوب تھے۔ شوگر کے مریض تھے اور انسولین لگاتے تھے۔ دل کے مریض تھے اور معدے میں السر تھا۔ ریڑھ کی ہڈی کے مہرے بھی گھسے ہوئے تھے۔ بلا کے سگریٹ نوش تھے، پان بھی کھاتے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور باقاعدگی سے وظائف کرتے تھے۔ مطالعہ اور لکھنا ان کے محبوب مشاغل تھے۔ بیک وقت کئی اصناف میں شاعری کی اور ایک ایک نشست میں کئی غزلیں کہیں۔ جب تک زندہ رہے مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ ان کے معاصر ادباء میں شوکت تھانوی، حفیظ جالندھری، سیّد ضمیر جعفری، حبیب جالب، دلاور فگار، پروین شاکر، جمال احسانی، شیر افضل جعفری، فضل دین گجراتی، سجاد باقر رضوی، فارغ بخاری،، باباعالم سیاہ پوش، جوش ملیح آبادی، طفیل ہوشیارپوری، محسن نقوی، ساغر صدیقی، تنویر نقوی اور شورش کاشمیری وغیرہ شامل ہیں۔

مظفرؔ وارثی صاحبِ دل، حساس اور درد مند شاعر تھے۔ ان کے مزاج میں نرمی، ٹھہراؤ اور گھلاوٹ تھی۔ انھوں نے اپنی شخصیت کے ان لطیف پہلوؤں کو اپنی شاعری میں سمو دیا۔ مظفرؔ وارثی ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ وہ (۱۴) کہتے ہیں:-

"شاعر یا ادیب فی الحقیقت وہی ہو سکتا ہے جو اپنے عہد کا پورا شعور رکھتا ہو۔ تبھی وہ زندگی اور سماج کی اصل معنوں میں ترجمانی کر سکتا ہے۔ ہر دَور میں ادب کے تقاضے اور ادیب کے فرائض بدلتے ہیں۔ قلم کار محض ایک عہد کا ترجمان نہیں ہوتا بلکہ اس کا اولین کام ماضی، حال اور مستقبل میں رشتہ جوڑنا ہوتا ہے۔"

بقول اُن کے سچ لکھنے والے سے بڑا کوئی ترقی پسند نہیں ہوتا، لہٰذا ایک فن کار کو اپنے فن کے ذریعے معاشرے میں آوازِ حق بلند کرنی چاہیے۔ شہزاد احمد (۱۵) کہتے ہیں:-

"اس میں عوامی شاعر بننے کے پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ اسے مُلک کی ٹھوس سیاسی صورتِ حال کا ادراک ہے اور عوام کے شعور کو پوری طرح پیدا کرنے کا اہل ہے۔"

اُنھوں نے کبھی کسی کی دل آزاری اور دل شکنی نہ کی اور نہ کسی سے انتقام لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ناقدین کے اس مقولے کو نہیں مانتا کہ شاعر خالی ہو جاتا ہے تو نثر کی طرف آتا ہے۔ میرے نزدیک نثر نگاری شاعری سے زیادہ مشکل کام ہے۔

تصانیف:

مظفر وارثی مرحوم کے پندرہ مجموعے منصہ شہود پر آئے۔ جن میں سے غزل کے پانچ مجموعے، حمد و نعت کے چھے مجموعے، نظم کے دو مجموعے، ایک گیتوں کا مجموعہ، ایک قطعات کا مجموعہ شامل ہیں۔ ان کی بعض کتابوں کے دو، چار اور چھے چھے ایڈیشن شائع ہوئے۔

غزلیہ شاعری:

- برف کی ناؤ | نیو ایج پبلی کیشنز، لاہور | ۱۹۷۲ء
- لہجہ | ۱۹۸۴ء
- کُھلے دریچے بند ہوا | القمر انٹر پرائزز، لاہور | ۱۹۹۳ء
- راکھ کے ڈھیر میں پھول
- تنہا تنہا گزری ہے

حمدیہ و نعتیہ شاعری:

- بابِ جرم | آئینہ ادب لاہور | ۱۹۹۲ء، ۱۹۸۴ء، ۱۹۷۶ء
- نورِ ازل | ماورا بکس لاہور | ۱۹۸۴ء
- الحمد | ماورا بکس لاہور | ۱۹۸۴ء
- کعبہ عشق | سنگِ میل، دہلی | ۱۹۸۹ء
- دل سے درِ نبیؐ تک
- میرے اچھے رسولؐ | القمر انٹر پرائزز لاہور | ۱۹۹۶ء

ماورا بکس لاہور | ۱۹۸۸ء

نظمیہ شاعری:

- حِصار
- ظلم نہ سہنا

گیت:

- لہو کی ہریالی | سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور | ۱۹۸۸ء

قطعات:

• ستاروں کی ابجُو	سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۸ء

اعزازات:

• پرائڈ آف پرفارمنس	(صدارتی تمغہ حُسنِ کارکردگی)	۱۹۸۸ء
• بہادر شاہ ظفر ایوارڈ	عالمی سمینار و مشاعرہ دہلی (بھارت)	
• پی ٹی وی ایوارڈ	پاکستان ٹیلی ویژن	
• افتخار غالب ایوارڈ	غالب اکیڈمی دہلی	
• وثیقہ اعتراف	"شاعر امروز" ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان	
• مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ	مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی دہلی	
• ٹیلنٹ ایوارڈ	روزنامہ جنگ پاکستان	
• قومی شخص ایوارڈ	ادارہ قومی تشخص	
• بولان اکیڈمی ایوارڈ	فلم "بارود کا تحفہ" لاہور	

اعترافِ فن:

مندرجہ بالا ایوارڈز کے علاوہ بہت سے اداروں کی طرف سے مختلف مواقع پر شیلڈز عطا کی گئیں۔

- ۱۹۹۱ء میں اخلاق اختر نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے نگران روزینہ اختر کی نگرانی میں "مظفر وارثی فن اور شخصیت، کے عنوان سے ایم اے اردو کا مقالہ لکھا۔
- ۲۰۰۰ء میں پنجاب یونیورسٹی رضیہ سلطانہ سحر نے فخر الدین نوری کی نگرانی میں "مظفر وارثی اور ان کی شاعری" کے عنوان سے ایم اے اردو کا مقالہ لِکھا۔

اس کے علاوہ آڈیو کی شکل میں سینکڑوں کیسٹس منصہ شہود پر آئیں۔ ویڈیو کی صورت میں بھی دستاویزی فلم، حمد و نعت، غزل اور سلام وغیرہ موجود ہیں۔

پاکستان کے چوٹی کے گلوکاروں نے جِن میں ملکہ ترنم نور جہاں، مہدی حسن، غلام علی، خورشید بیگم، استاد امانت علی خاں، حمیرا چنا، فریدہ خانم، مسعود رانا، اروناؔ لیلیٰ، ناہید اختر، کوثر پروین، مریم رامے، سائرہ نسیم، غلام عباس، مہ جبیں قزلباش، نصرت فتح علی خاں، غلام فرید صابری، عدنان سمیع، بہاؤالدین قوال شامل ہیں، نے مظفر وارثی کا کلام مختلف اصناف میں گایا ہے۔ بھارت میں بھی ان کے کلام کی پذیرائی کی گئی اور لتا منگیشکر، جگجیت سنگھ، چترا سنگھ، انور رفیع، عزیز نازان، اختر آزاد، پرویز اختر وغیرہ نے ان کے کلام کو زبان دی۔

وفات:

مظفر وارثی عہدِ حاضر میں پاکستان کے نمایاں ترین نعت خواں تھے۔ اُن کے عقیدت مندوں اور مداحوں کا شمار کرنا ناممکن ہے۔ اُن کا اپنا ایک جداگانہ شعری نظام تھا اور اپنے اشعار کو انھوں نے ہمیشہ گا کر پیش کیا۔ اللہ نے انھیں خوش الحانی عطا کی تھی وہ لفظ کو پرکھنے کا ہنر جانتے تھے۔

اردو ادب کی تاریخ میں مظفر وارثی کی مستند نعت گو شاعر گردانے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے کہیں بڑے غزل گو شاعر تھے لیکن ناقدین کے ہاں اُن کی غزل گوئی کے حوالے سے ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اُن کو بطور غزل گو مکمل طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام قاری اُن کی غزل کے اوصاف سے ناواقف ہے۔

مظفر وارثی کئی بیماریوں میں مبتلا تھے لیکن سب سے بڑی بیماری ناقدری زمانہ تھی۔ اُنھیں رعشہ کی بیماری تھی ۲۰۱۰ء میں فخر زمان اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین تھے۔ رائٹرز گلڈ کی جانب سے درخواست پر دس ہزار کا چیک مظفر وارثی کے نام پر بجھوایا گیا۔ لیکن شکریے کے ساتھ وہ چیک یہ کہہ کر واپس بجھوادیا گیا کہ "ساری زندگی ادب کی خدمت کا صِلہ ہے تو مجھے قبول نہیں۔ میں اتنا گیا گزرا نہیں کہ اکادمی کی یہ قلیل سی امداد لے کر خود کو آزمائش میں ڈال لوں۔"

وہ ایک خوددار انسان تھے۔ ساری عمر ادب کی تحقیق وترویج میں گزار دی۔ اُن کا اپناہی ایک شعر ہے

قدم قدم آزمائشوں کی فضا ملی ہے
ہمیں تو ہر دور میں نئی کربلا ملی ہے

مظفر وارثی کافی عرصہ علالت کے بعد ۲۸، جنوری ۲۰۱۱ء کو ۷۷ برس کی عمر میں خالقِ حقیقی سے جا مِلے۔ نمازِ جنازہ جوہر ٹاؤن لاہور میں محمد علی قصوری نے پڑھائی۔

ع   حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

فصل دوم

"گئے دنوں کا سُراغ" کا موضوعاتی جائزہ:

فنِ سوانح نگاری میں آپ بیتی ایک اہم، معروف اور مستند صنف ہے۔ اردو ادب اس حوالے سے خاصا ثروت مند ہے کہ اس میں کم و بیش ساڑھے چار سو سے زائد آپ بیتیاں تحریر کی جا چکی ہیں۔ اس سرمائے میں کثیر تعداد ایسی آپ بیتیوں کی ہے جنھیں اردو ادباء اور شعراء کرام نے تحریر کیا ہے۔

مظفر وارثی کی آپ بیتی "گئے دِنوں کا سُراغ" مارچ ۲۰۰۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس لحاظ سے یہ آپ بیتی موضوعات کے پھیلاؤ کے حساب سے عہدِ حاضر کا تازہ ترین منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ اس عہد کی آپ بیتیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سائنسی طرزِ فکر اور جدید ادبی رجحانات کے علاوہ بدلتے ہوئے عصری تقاضوں کا بھی علم ہوتا ہے۔

انکشافِ ذات کا رجحان روزِ ازل سے انسانی فطرت کا خاصہ رہا ہے۔ اپنی ذات کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا اور اپنے تجربات میں دوسروں کو شریک کرنے کا سلسلہ قدیمی ہے۔ آُپ بیتی کے ابتدائی نقوش، زمانہ قدیم کے تذکرہ نگاروں، صوفیا کرام کے مکتوبات اور اولیاء کے ہاں پائے جاتے ہیں لیکن ایک مکمل صنف کی صورت میں خود نوشت بیسویں صدی کے آغاز میں اردو نثر کا حصہ بنی۔ آپ بیتی لکھنا ایک مشکل امر ہے۔ اِسے تحریری اور تخلیقی صورت اُسی وقت دی جا سکتی ہے جب لکھنے والی شخصیت واقعات کو صحیح تناظر میں پیش کرنے کی ہمت رکھتی ہو۔ اور اُس کے اندر غلط روایات کو دُور کرنے اور اپنے ذاتی تجربات سے دوسروں کو مُستفیض کرنے کا سچا جذبہ موجود ہو۔

ناقدینِ ادب نے خود نوشت کے لیے اظہاریت، صداقت اور جمالیاتی کیفیت کو لازمی قرار دیا ہے۔ توازن اور تناسب ہر فن کے لیے ضروری ہے۔ اگر لکھنے والا اس بات کا خیال نہ رکھے گا تو خود نوشت میں کسی چیز کی کمی یا بیشی ضرور نظر آئے گی۔ سوانح در حقیقت تین بنیادی عناصر پر مشتمل ہے۔

- تاریخ
- فرد
- کہانی

کسی بھی سوانح میں اگر یہ تینوں عناصر خاص تناسب کے ساتھ موجود ہوں گے تو وہ ایک دل چسپ اور اعلیٰ سوانح گردانی جائے گی۔

سوانح لکھتے ہوئے بھرپور تصویر کشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تصویر کشی خود اپنی ذات کی بھی ہو سکتی ہے اور کسی دوسرے کے بارے میں رائے کی صورت میں بھی سامنے آسکتی ہے۔ ذاتی زندگی کے سطحی واقعات کے ساتھ باطنی کیفیات، نفسیاتی حالت، رجحان پسندی اور ذہنی ارتقاء کا بھرپور احاطہ ایک اچھی خود نوشت کو سامنے لاتا ہے۔ یہ تمام امور اس طرح انجام دیے جانے چاہئیں کہ آپ بیتی نگار کی ایک واضح تصویر قاری کی نظر کے سامنے آجائے۔ سوانح نگاری کی اس تکنیک سے جہاں فرد کی زندگی کے اساسی پہلو اور کردار کے خدوخال دل چسپ اور جاذبِ نظر ہو جاتے ہیں وہاں سوانح کا اسلوب بھی قدرت رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ آپ بیتی لکھنا در اصل مشکل کام ہے کیونکہ اس میں مصنف کو سچائی کا دامن نہایت مضبوطی سے تھامنا پڑتا ہے۔ بقول آل احمد سُرور(16) :-

> "جینا ایک فن ہے اور آپ بیتی فنِ لطیف۔ اس سے عہدہ بر آہونے کے لیے بڑی سچائی، بڑے ریاض اور بڑے کھرے پن کی ضرورت ہے۔"

آپ بیتی میں مصنف کے احساسات و خیالات اور جذبات و تجربات کا عکس نمایاں نظر آنا چاہیے۔ اس میں مصنف کی زندگی کے تمام حالات شامل نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ صرف ان واقعات کا احاطہ کرتا ہے جنھیں وہ طشت ازبام کرنا چاہتا ہے یا جن سے اس کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ بقول ڈاکٹر قاضی(17) :-

> "آپ بیتی کی حیثیت ایک فن پارے کی ہے وہ پھولوں کی خود رَو جھاڑی نہیں ہے۔ آپ بیتی کو پھولوں کے صحیح انتخاب کے بعد چابک دستی سے بنایا ہوا ایک گلدستہ ہونا چاہیے۔"

آپ بیتی لکھنے والا اپنی وفات کے واقعات کو نہیں لکھ سکتا۔ جبکہ اس سوانح نگار کسی شخصیت کی پیدائش سے وفات تک کے حالات و واقعات کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ آپ بیتی میں سوانح عمری کی نسبت سچائی کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین(18) کہتے ہیں:-

> "آپ بیتی میں صفات کا لبادہ اُتار کر اپنی ذات کو عریاں دیکھنا معمولی دل گردے کا آدمی کا کام نہیں۔ اپنی ذات کو اس طرح دیکھ کر کبھی رونا آتا ہے کبھی ہنسی، خود نوشت سوانح حیات میں آخری منزل فنا اور بقا کی ہے۔ اپنے آپ کو باقی کیسے رکھا جائے، یہ سب کا مسئلہ ہے۔ آپ بیتی اس مسئلے کا تحریری اظہار اور کبھی کبھی جواز بھی ہے۔ آپ بیتی میں بقا کا حصول اپنے آپ کو فنا کیے بغیر ممکن نہیں۔"

اگر آپ بیتی کی تکنیک کی بات کی جائے تو اسلوب بھی صنف کو پُرکشش اور جان دار بنا دیتا ہے۔ اسلوب کی اہمیت ادب پارے میں اساسی ہے۔ بہترین اور اعلیٰ خیالات بھی اسلوب کے بنا مؤثر نہیں ہو سکتے۔ ناقدین کہتے ہیں کہ طرز و اسلوب خیال کا لباس ہی نہیں بلکہ اس کی کھال ہے۔

"گئے دِنوں کا سُراغ" مظفر وارثی کی داستانِ حیات ہے۔ مظفر وارثی اردو ادب کا معتبر حوالہ ہیں۔ اُن کا نام ایک نعت گو، نعت خواں کے طور پر جانا جاتا ہے۔ جبکہ وہ ایک بہترین غزل کہنے والے تھے۔ بطور غزل گو اُن کو پذیرائی نہیں بخشی گئی لیکن اُن کے ادبی قد کاٹھ میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ وہ بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ "گئے دِنوں کا سُراغ" مارچ ۲۰۰۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔

یہ کتاب ۲۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے خزینہ علم و ادب لاہور نے زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے۔ ۵۳ سُرخیوں کے ساتھ "پیش آہنگ" کے نام سے پیش لفظ بھی موجود ہے۔ پیش لفظ میں وارثی (19) رقم طراز ہیں:-

> "جرأت اظہار ہمارا وہ جرم ہے جس کی سزا ہم اپنی عمر سے زیادہ کاٹ چکے ہیں۔ جہاں تک واقعات کی درستی نادرستی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ہم صرف اتنا کہیں گے کہ اگر مصلحتیں ہم سے جھوٹ بُلوا سکتیں تو ہم یہ کام ہی نہ کرتے........ شاعر تو ہم بُرے تھے جیسے بھی ہیں وہ تو ہیں، نثر نگار تو ہرگز نہیں یہ تو تمام عُمر کا کرب ہے جو کاغذ پر انڈیل دیا۔"

اس آپ بیتی میں مظفر وارثی نے اپنے عروج و زوال کی داستان رقم کی ہے۔ اُنھوں نے اپنی داستان کا آغاز اپنے شجرہ منصب اور آباؤ اجداد سے کیا ہے۔ اُن کا ماضی تابناک تھا لیکن پوری آپ بیتی میں اُنھوں نے کہیں بھی متکبرانہ طرزِ گفتگو اختیار نہیں کیا، اُنھوں نے اپنی اس آپ بیتی کا انتساب "ماضی و فردا" کے نام سے کیا ہے۔

ابتداء میں مصنف نے "سلسلہ نصب" کے عنوان سے اپنا سلسلہ سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جوڑا ہے۔ اُنھوں نے "میر ٹھ"، "جدِ امجد"، "علامہ صوفی وارثی" کے ابواب میں تفصیل کے ساتھ اپنا خاندانی پسِ منظر بیان کیا ہے۔ اس بیانیے کے لیے اُنھوں نے "ہم" کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ آپ بیتی ایک عام حساس دل رکھنے والے سچے آدمی کا بیان معلوم ہوتی ہے۔ اس میں مظفر وارثی نے بلا کم و کاست اپنے عیوب و ثواب بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ وارثی (20) لکھتے ہیں:-

> "ہماری ولادت اور والد کی احرام پوشی آگے پیچھے ہوئی۔ قلندری اور سخن وری طُرۂ آباء سمجھیے۔"

اپنے بچپن کے واقعات میں وہ میرٹھ کے مشاعروں کا ذکر کرتے ہیں۔ میرٹھ کو "دلی کا بچہ" کہتے ہیں۔ اس لیے یہاں بھی دلی کی طرح مشاعروں کا رواج عام تھا۔ غلام محی الدّین عشق مبتلا کے مکان میں باقاعدگی سے طرحی مشاعرے ہوتے تھے اس کے علاوہ "نوچندی دروازہ" میں ہر سال ایک میلہ لگتا ہے۔ یہ میلہ ایک ماہ تک چلتا رہتا ہے جِس میں ایک دن مشاعرے کے لیے مختص ہے۔ بقول مظفر وارثی اُنھوں نے سب سے پہلے اسی مشاعرے میں اشعار پڑھے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اشعار والدِ محترم کے تھے جِن کا نام "صوفی وارثی میرٹھی" تھا۔

"گئے دِنوں کا سُراغ" مظفر وارثی کے مصائب، تلخ واقعات، تجربات اور احساسات پر مشتمل ہے۔ اُنھوں نے ایسے حقیقی پیرایے میں اپنی زندگی کا احاطہ کیا ہے کہ یہ آپ بیتی ایک منفرد ادبی کارنامہ بن گئی ہے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے سچے واقعات کو کھرے اور سادہ الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری اُن کا گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے اور مظفر وارثی سے ہمدردی محسوس کرنے لگتا ہے۔ "ہمارا بچپن" کی ذیل میں تقسیم کے آنکھوں دیکھے واقعات کا تذکرہ وارثی (21)اِس انداز میں کرتے ہیں:-

> "ہندوؤں نے گنگا کے میلے کو مسلمانوں کا مقتل بنادیا۔ اپنے اشنان۔۔۔۔ اور پوجا سے فارغ ہو کر انھوں نے اس ہولناک منصوبے پر عمل کیا تھا۔ عورتوں کی آبروریزی کی تھی، پستانوں کو کاٹ دیا گیا، شرم گاہوں میں نیزے گاڑے گئے، بچوں کو اُچھال اُچھال کر تلواروں میں پرو دیا گیا۔ کنویں لاشوں سے پٹ گئے۔"

مظفر وارثی کی آپ بیتی میں افلاس، ناداری، مشکلات اور مظلومیت کے قصے جابجا بیان کیے گئے ہیں۔ جن سے قاری ان کی صداقت پر یقین کرنے لگتا ہے کیونکہ کوئی بھی شخص اپنے کمزور پہلو دوسروں پر عیاں کرنا نہیں چاہتا۔ آپ بیتی کی ابتداء مظفر وارثی نے اپنے رئیس دادا اُن کی جائیداد اور اُن سے متعلقہ واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ بعد میں مظفر وارثی نے اپنے والد کے قلندرانہ مزاج، ہماری اور اپنی جدوجہد کا ذکر پُر خلوص طریقے سے کیا ہے۔ اس آپ بیتی کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ تنگ دستی کتنی بڑی مصیبت ہے اور دولت کِس طرح شرفِ انسانیت پر جگہ جگہ حملہ آور ہوتی ہے۔ زندگی کی سختیوں سے مسلسل نبرد آزما رہنے والے مظفر وارثی نے ناگفتہ بہ حالات کے باوجود مطالعے اور شعر گوئی کے ذوق کو مرنے نہیں دیا۔ مظفر وارثی عزم و ہمت کے ذریعے آگے بڑھتے رہے۔ اپنی ملازمت کے باب میں (22)لکھتے ہیں:-

> "ضروری کاروائی کے بعد ہمیں ملازمت مل گئی۔ یہ کائن نوٹ ایگزامنر جب پہلے دن اسٹیٹ بنک میں داخل ہوا تو اس کے جسم پر پیلے رنگ کا کُرتا اور

سفید پاجامہ تھا۔ اوپر سے نیچے تک دونوں پائنچوں میں پیوند لگے ہوئے تھے
اور اس خود داری کو ذرا بھی شرم نہیں آرہی تھی۔"

انسان فطری طور پر حریت لے کر پیدا ہوتا ہے مگر بہت ہی قلیل لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تادمِ مرگ اپنی عزتِ نفس، انا اور خود داری کو قائم رکھتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ اس قدر مادیت پرستی کا شکار ہو چکا ہے کہ حواس تو بیدار ہیں لیکن ضمیر مُردہ ہو چکا ہے۔ اپنے تحفظ کے لیے عزت اور وقار تک کو داؤ پر لگا دیا جاتا ہے۔ یہ سب شرفِ انسانی اور وقار و منصب کے لیے موزوں نہیں۔ خود دار آدمی بھی اپنے مؤقف پر سمجھوتہ نہیں کرتا۔ بھلے اُسے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنے پر خسارہ ہی اُٹھانا پڑے۔ اصُولوں پر سمجھوتہ کرنا کمزور شخصیت کی علامت ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ "گئے دِنوں کا سُراغ" آپ بیتی میں وارثی (23) بیان کرتے ہیں:-

"آپا جی کا دُور پَرے کا رشتہ دار آلِ حسن خدا جانے کہاں سے آگیا اور ابا میاں جی کو پٹی پڑھانے لگا۔ خالو میاں! کب تک آپ اس چھوٹے سے کمرے میں رہیں گے میرے ساتھ چلیں ہندوؤں کے سینکڑوں مکان بند پڑے ہیں ۔ کسی ایک کا تالا توڑ کر اندر گُھس جائیں گے۔ ہو بھی یہی رہا تھا......... اُس نے لاکھ کہا، "آپ میرے پاس کھڑے رہیں۔" اُنھوں نے کہا بھلے آدمی ایک احرام پوش ایک چور کی پاسبانی کرتے ہوئے اچھا لگے گا؟"

مظفر وارثی کا کلام بھی تصویر خودی اور خودداری کا مظہر ہے۔ اُنھوں نے مانگے ہوئے سائے کی بجائے دھوپ کی حدت اور شدت کو قبول کیا ہے۔ پاؤں سلامت ہے تو پھر بیساکھیوں کا سہارا لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی آپ بیتی "گئے دِنوں کا سُراغ" میں مظفر وارثی نے قناعت پسندی اور متحمل مزاجی کا تذکرہ کیا۔ بقول اُن کے خوشی اور غم دونوں میں صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہیے اور قناعت پسندی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا چاہیے۔ توازن انسان کو کبھی ہارنے اور گِرنے نہیں دیتا۔ لاحاصلیت نے انسان کو درماندہ کر دیا ہے۔ دورِ حاضر میں ہر شخص ترقی کا خواہش مند ہے مگر عملی طور پر کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ سماج کے ہر شخص نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال رکھا ہے۔ کوئی بھی فرد اپنی حقیقی صورت اور سیرت کی بہتری کے لیے کوشاں نہیں۔ ہر کوئی معاشرے کو بُرا کہتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ معاشرہ دراصل افراد کا مجموعہ ہے۔ ہم ٹھیک ہوں گے تو معاشرہ سُدھار کی طرف مائل ہو گا۔ مظفر وارثی نے اپنی آپ بیتی میں معاشرے کے تضاد اور دوہرے معیار کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے آپ بیتی میں زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ذات کا احاطہ کیا ہے اور اپنے تجربات میں قاری کو شامل کیا ہے۔ "ہم اور پاکستان عوامی تحریک" کے باب میں نامور خطیب طاہر القادری کے بارے میں وارثی (24) تحریر کرتے ہیں:-

"طاہر القادری کو امام خمینی بننے کا بہت شوق تھا لیکن انداز سارے رضا شاہ پہلوی والے تھے۔ ایک صاحب نے مجلسِ شوریٰ میں پوچھا" آپ مخالفین کے ساتھ کیوں جا بیٹھے" تڑپ کر بولے" خبروں میں "IN" بھی تو رہنا ہے۔ یہ بات سو فیصد درست ہو گی کیونکہ اِن کی ہوسی شہرت کے ہم عینی گواہ ہیں۔"

مظفر وارثی گو عملی طور پر کبھی بھی سیاست میں نہیں آئے لیکن سیاست کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ عوامی لیڈر ان کی دوغلی پالیسی اور بے جان نعروں کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہوئے (25) کہتے ہیں:-

"شدید گرمی میں تپتی ہوئی سڑکوں پر لوگ گھنٹوں اپنے "قائد" کا انتظار کرتے اس طرح کے پیشگی انتظامات کر دیے جاتے تھے تو سیدھے سادے عوام مصطفوی انقلاب کے نعرے لگاتے نہیں تھکتے تھے............ڈرائیور کو حکم دے رکھا تھا کہ ان کے گھر سے نکلنے کے آدھ گھنٹے قبل گاڑی کا اے سی چلا دیا کرے۔ گاڑی یخ ہو جاتی تو قائدِ محترم بر آمد ہوتے........ مصطفوی انقلاب کے داعی خورد و نوش کی چیزیں تک خدّام لے کر چلتے۔ پجیرو (کار) کا پچھلا حِصہ اِنھی ضروریات کے لیے ہوتا۔"

مظفر وارثی نے "گئے دِنوں کا سُراغ" میں حقیقت نگاری کو فروغ دیا ہے۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ادیب چاہے شاعر ہو یا نثر نگار، اس کا اوّلین فرض ماضی، حال اور مستقبل کا آپس میں رشتہ جوڑنا ہوتا ہے۔ اس لیے اسے اپنے عہد کا کُلّی شعور اور احساس ہونا ضروری ہے۔ اس شعور کی موجودگی میں ہی وہ سماج کی اصل معنوں میں ترجمانی کر سکتا ہے۔ وہ (26) کہتے ہیں:-

"جو شاعر بدلے ہوئے ماحول کے ساتھ چل نہیں سکتے ان کی تخلیقات اپاہج ہو جاتی ہیں۔"

معاشرتی دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھنے والا ہی حقیقی فنکار ہوتا ہے۔ ایک سچا ادیب استبدادِ زمانہ کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے سرِ وار جانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

مذہبی، قومی، طبقاتی اور سیاسی سطح پر روزِ اوّل سے ہی داعیانِ حق کے لیے رکاوٹیں آتی رہی ہیں۔ مگر ایک سچا ادیب اپنے قلم سے جہاد کا فریضہ انجام دیتا ہے نہ کہ غداری۔ قلم کی ناموس کو ہر صورت بر قرار رکھنا، صاحبانِ علم کا شیوہ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں انفرادیت رنگ برنگے کپڑے پہننے سے نہیں بلکہ ذاتی تجربے اور کردار سے پھوٹتی ہے۔

نظریہ فن سے جنم لیتا ہے، فن نظریے سے نہیں۔ مظفر وارثی کے ہاں نظم ہو یا نثر مذہب اور مذہبی موضوعات غالب نظر آتے ہیں۔ اپنی آپ بیتی "گئے دِنوں کا سُراغ" سے بھی وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاتھ تصوف اور اخلاق کثرت سے نظر آتا ہے۔ ورق ورق نیکی اور بھلائی کا درس ملتا ہے۔ نبی احمد (27) مظفر وارثی کے فکر و فن کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-

> "مظفر وارثی نے غزل، نظم، حمد، نعت، سلام، گیت، قطعات اور ہائیکو میں طبع آزمائی کی ہے۔ جدید اردو غزل میں منفرد اسلوب اور متنوّع موضوعات کے باعث اردو غزل میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔"

ہدایت کے لیے انسانی کوشش اور قلبی آمادگی کا ہونا ضروری ہے، تبھی ربِ کائنات اپنے بندے کو نیکی اور ہدایت کی توفیق بخشتا ہے۔ مظفر وارثی کی آپ بیتی کا مطالعہ کرنے سے قاری اُن کے خیالات سے فیض یاب ہوتا ہے۔ مظفر وارثی انسان کے اندر کے جہاں کو تصویرِ کائنات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک خدا اور کائنات کی آگاہی سے قبل ہر انسان کو خود شناسی کی ضرورت ہے۔ جب تک کوئی فرد خود کو نہیں جان لیتا تب تک اُس پر اسرارِ خدائی نہیں کُھلتے۔

"گئے دِنوں کا سُراغ" میں مظفر وارثی نے اپنے معاصر شعراء اور ادباء کو الگ الگ باب میں بانٹ کر اُن پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اُنھوں نے اس ضمن میں خواجہ دِل محمد، حکیم نیّر واسطی، حفیظ جالندھری، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، حبیب جالب، منیر نیازیؔ، شہزاد احمد، سیف زلفی کے ساتھ اپنی نشت وبرخاست کا احوال لکھا ہے۔ یوں آپ بیتی ایک تذکرے کی صورت اختیار کر گئی ہے جِس میں مشہور شخصیات کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مشہور شاعر احسان دانش کے بارے میں وارثی (28) قلم سرا ہیں:-

> "احسان صاحب کا زٹل گوئی میں بھی جواب نہیں تھا۔ سفر میں مصرع دے دیا جاتا۔ احسان صاحب سب سے زیادہ اور زیادہ دلچسپ شعر کہتے۔"

اسی طرح احمد ندیم قاسمی کے بارے میں (29) لکھتے ہیں:-

> "شاعر، افسانہ نگار، کالم نگار، احمد ندیم قاسمی ایک نہیں تین شخصیتوں کا نام ہے یا تین مہروں کی ایک بساط۔ کسی زمانے میں ہمارے دوست احباب کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ پردے ہٹتے گئے دوست گھٹتے گئے۔"

سماجی ناہمواری کا وہ بار بار تذکرہ کرتے ہیں۔ معاشرتی افراتفری کو دیکھ کر وہ سماج پر سوالات اُٹھاتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ظالم خون کی ہولی کھیل رہے ہیں اور مظلوم کو آہ و بقا تک کی اجازت نہیں۔ انسان کی قدر ذہانت اور

قابلیت کی بجائے پیسے اور دستار سے کی جاتی ہے۔ معیار کا پیمانہ مادیت ہے۔ انصاف کی عدم فراہمی عدلیہ کے لیے باعثِ شرم ہے۔ ایک غریب ساری زندگی عدالتوں کے چکر کاٹتے گزار دیتا ہے لیکن اُسے کہیں سے انصاف نہیں ملتا۔ اس کے برعکس عدل خریدنے والے احتسابی بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ امراء کو گھروں سے بُلا کر انصاف کی پیش کش کی جاتی ہے اور غریبوں کی فریادیں قہقہوں میں اُڑادی جاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قیامِ پاکستان سے پہلے لوگ غیروں سے لُٹ رہے تھے لیکن جب یہ مملکت وجود میں آگئی تو طوفانِ بلاخیز نے کمزور کے گھر کا رستہ دیکھ لیا۔ "گئے دِنوں کا سُراغ" آپ بیتی میں تقسیم کے واقعات اور ہجرت کے المیے کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ ہجرت کے واقعات اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کو وہ صراحت سے بیان کرتے ہیں۔ لُٹے گئے مہاجرین جب رہزنوں سے آزادی حاصل کر کے پاک سرزمین پہنچے تو رہبروں نے اپنا غلام بنالیا۔

وطن سے محبت جزو ایمان ہے لیکن اس وطن کے امراء غریبوں کو لوٹ کر اپنی تجوریاں تو بھر رہے ہیں اور عام شہری گوناگوں مسائل کا شکار ہے۔ مظفر وارثی نے مارشل لا کی صعوبتیں بھی جھیلی تھیں اور برطانوی دور کی آمریت سے بھی آشنائی تھی۔ اسی لیے وہ اس نظام کے خلاف تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آمر کسی طور بھی عوام کی مسیحائی نہیں کر سکتا۔ وہ جمہوری نظام کے بھی خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جمہوری نظام کے ذریعے کٹھ پتلی حکومت عوام پر مسلط کی جاتی ہے۔ جمہوریت کی بجائے وہ مصطفوی انقلاب کے حق میں تھے۔ اسی لیے عوامی تحریک میں شمولیت بھی اختیار کی تھی لیکن جلد ہی حقائق ظاہر ہونے پر اسے خیر آباد کہہ دیا تھا۔ آپ بیتی میں بے نظیر اور ضیاالحق کے ابواب میں اُنھوں نے بڑی تفصیل سے کئی اندرونی باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جمہوریت کے علم بردار عوامی نظریات کی ترجمانی کے بہانے ایک انقلابی شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں اور ووٹ لینے کے بہانے عوام میں گھل مل جاتے ہیں۔ وہ عوام کے مسائل کو اپنا کہہ کر عام آدمی کی ہمدردیاں خریدتے ہیں اور اُن کی بولی بول کر عام آدمی کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ جب یہ لوگ اقتدار حاصل کر لیتے ہیں تو عوامی سوچ کے نئے نئے طریقے وضع کرتے ہیں۔ وہی لوگ جن کی بدولت اِنھیں اقتدار حاصل ہوتا ہے اُن پر تنقید کرتے ہیں، ان کی آواز دباتے ہیں اور فلسفے اور ظلم و تشدّد کے ذریعے اِنھیں موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور باغی قرار دیتے ہیں۔

وارثی(30) اپنے بارے میں وہ بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

> "شاعر کو بالعموم غیر ذمے دار شخص سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ شاعری شعور سے وجود پذیر ہوتی ہے اور غیر ذمے داری سے بے حسی اور شعور ایک میان میں نہیں رہ سکتے، یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہی نہیں حقیقت بھی ہے۔"

گو مظفر وارثی نے غزل، نعت اور دوسری کئی اصناف میں اپنی فنی ہُنر مندی دکھائی لیکن آپ بیتی "گئے دِنوں کا سُراغ" میں بھی وہ ایک کہنہ مشق ادیب کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔ ان کی آپ بیتی انھیں بڑے آپ بیتی نگاروں کی صف میں اپنے منفرد لب و لہجے کی بدولت کھڑا کرتی ہے۔ جس طرح انھوں نے شاعری میں اپنالوہا منوایا اسی طرح نثر میں بھی انھوں نے اپنا منفرد انداز اور نمایاں مقام پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

فصل سوم

"گئے دِنوں کا سُراغ" کا فنی اور اُسلوبی جائزہ

ہمارے ہاں خود نوشت یا سوانح عمری انکشافِ ذات سے زیادہ ستائشِ ذات کے لیے لکھی جاتی ہے۔ یوں اس کی تنقید بھی زیادہ تر ستائشِ باہمی پر ہی اُٹھائی جاتی ہے۔ خود نوشت یا آپ بیتی تحریر کرنے والا اہم معاصرین سے مخاطب نہیں ہوتا بلکہ اُس کا مخاطب آنے والی نسل سے ہوتا ہے۔ وہ آنے والی نسلوں کے اپنی شخصیت کی مختلف جہات کی پردہ کشائی کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ہم عصر تو اس کی ذات سے آشنا ہوتے ہیں۔ اگلی نسل یا تیس، چالیس، پچاس برس بعد والے لوگ جب اس خود نوشت کو دیکھیں گے تو اُن کے سامنے نہ آپ بیتی نگار ہوگا نہ وہ زمانہ اور نہ اُس کے معاصر......جو مدح و ستائش یا ہجو و طنز کر سکیں۔ قاری اسی آپ بیتی کے آئینے میں ہی اُس شخصیت کے خال و خط تلاش کرے گا۔ اسی لیے علمائے ادب نے کہا ہے کہ آپ بیتی میں لکھے گئے حالات وقت کی چھلنی میں سے گزارے جائیں۔ خود نوشت لکھنے والے کے لیے بھی یہ لازم ہے کہ وہ صرف وہ باتیں یا حالات لکھے جِن کی صداقت کا اُسے کُلی وثوق ہو۔ آپ بیتی لکھنے والا اپنی شخصیت کے حالات وواقعات کا ہالہ حقائق پر مبنی استوار کرتا ہے ورنہ اُس کی ساری شخصیت اصل حقائق کا علم ہونے پر دھڑام سے زمین بوس ہو جائے گی۔

ڈاکٹر پرواز ی(31) اپنی کتاب "پس نوشت اور پس پسِ نوشت: خود نوشتوں کا جائزہ" میں لکھتے ہیں:-

> "ہمارے ہاں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں خود نوشت لکھنے والوں
> نے خود اپنی شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔"

لیکن ایک بات طے ہے کہ بے شک آپ بیتی ذات کے انکشاف کا نام ہے لیکن انکشاف بھی ایک حد تک اچھا لگتا ہے۔ داؤد رہبر (32) پرویز پرواز ی کے نام لکھے گئے ایک خط میں رقم طراز ہیں:-

> "گو کبھی قلم کار کی آپ بیتی صرف یاد نویسی نہیں ہوتی فریاد نویسی بھی ہوتی
> ہے۔ فریاد کی کوئی لہر نہیں ہوتی۔ نالہ کو اگر بند نہیں کیا جاتا ہے تو اسے بہاؤ
> کی ضرورت پڑتی ہے۔ لکھنے والا کہتا ہے دیکھ مجھ پر کیا بیتی؟"

اردو ادب میں سوانح عمری کا سلسلہ تو قدیم ہے لیکن آپ بیتی کا آغاز انیسویں صدی کے اول و آخر سے ہوتا ہے۔ ادبی تاریخ میں "سوانحی ادب" کی اصطلاح خاصی متنوّع ہے لیکن اسی میں تاریخ، واقعات و حالات، ڈائری، رپورتاژ اور تذکرہ نگاری سب کچھ ہی سما سکتا ہے۔ اگر اس دائرے کو تنگ کیا جائے تو "یاد داشتی ادب" یعنی

Memories اور Biography کو جداگانہ شناخت دی جاسکتی ہے۔ سوانحی ادب میں "خود نوشت سوانح عمری کا لفظ ۱۸۰۹ء میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ اپنی خود نوشت لکھتے ہوئے آپ بیتی نگار کے اسلوب کے ساتھ اُس کے کچھ مقاصد بھی ہوتے ہیں۔ آپ بیتی بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں لکھی۔ بعض نے اپنی ذات کو اہمیت دی، تو وہ اپنے عصر کو زیرِ بحث ہی نہیں لائے اور بعض نے اپنے ارد گرد کو بیان کرتے ہوئے اپنی ذات کو فراموش کر دیا۔

یہ بالکل درست ہے کہ خود نوشت کا مرکزی کردار "آپ بیتی نگار" پر ہوتا ہے۔ اس لیے تاریخ وواقعات کو اس کے سیّاق وسباق میں دیکھنا چاہیے لیکن یہ تو نہ ہو کہ صنف آپ بیتی ہو اور مصنف بالکل منہا ہو جائے یا کلیتہً مرکزی حیثیت اختیار کرلے۔ خود نوشت لکھنے کے بھی مختلف محرکات ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے تجربات میں دوسروں کو حِصہ دار بنانا، دوسروں کی اصلاح کرنے کے مقصد سے اپنی زندگی کے واقعات کو ضبطِ تحریر میں لانا یا خود کسی ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد دوسروں کو ان سانحات سے خبر دار کرنا کہ کوئی اور نقصان نہ اُٹھائے، تاریخ کی درستی، اصل واقعات سے آگاہی بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ خود نوشت سوانح نگار کا کام صرف سوانحِ عمری لکھنے والے سے مشکل اور سنجیدہ ہے۔ ڈاکٹر پروازی (33) لکھتے ہیں کہ:-

> "خود نوشت کے فن میں کم از کم تین عناصر اہم ہیں۔ لکھنے والے کی یادداشت، لکھنے والے کا اسلوب اور لکھنے والے کے ارد گرد کا حلقہ ءاحال و احباب۔"

اکثر لوگوں میں اتنی اخلاقی جرات ہی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے متعلق سچ بول سکیں۔ اور کئی یہ لکھنا چاہیں تو دوست احباب آڑے آجاتے ہیں۔ اسی لیے یہ بات طے ہے کہ خود نوشت سوانح عمری کسی شخص کی مکمل سوانح عمری نہیں ہوتی۔ اس میں صرف وہ باتیں ہوتی ہیں جو بیان کرنے والا بیان کرنا چاہتا ہے۔

"گئے دِنوں کا سُراغ" مظفر وارثی کی زندگی کے کم و بیش ۶۳ سالہ زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ اس آپ بیتی کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ یہ "ہم" کے صیغے میں لکھی گئی ہے جو اُن کی "میں" کو ظاہر کرتی ہے۔ "گئے دِنوں کا سُراغ" کے نام سے اردو ادب میں ایک اور آپ بیتی بھی ہے جسے نثار عزیز بٹ نے لکھا ہے اور یہ مظفر وارثی کی آپ بیتی کے بعد ۲۰۰۴ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی۔

وارثی (34) اپنی آپ بیتی کے بارے میں "پیش آہنگ" میں کہتے ہیں:-

> "سوانح حیات، حیات آفرین لوگوں کی ہوتی ہے۔ ہمیں یہ سُرخاب کے پَر ہم پر ٹوٹنے والی قیامتوں نے لگائے

ے کچھ نہ کہنے سے بھی چھن جاتا ہے اعزازِ سخن
ظلم سہنے سے بھی ظالم کی مدد ہوتی ہے"

مظفر وارثی نعت گو کے ساتھ نعت خواں بھی تھے۔ اللہ نے لحن سے نوازا تھا یوں اُن کی شاعری کا اثر دوآتشہ ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر پرویز پروازی نے اپنی کتاب "پس نوشت، پسِ پس نوشت" میں مظفر وارثی پر کڑی تنقید کی ہے۔ وہ اُنھیں خود پسند اور انا پرست شخص کہتے ہیں۔ پروازی (35) کہتے ہیں:-

"ہم نے بہت خود نوشتیں پڑھیں مگر اتنی خود نمائی اور خود پرستی کہیں نظر نہ آئی۔ حلانکہ اِنھیں معلوم ہے "احساسِ برتری ہو یا کمتری ویسے ہیں دونوں ایک ہی چیز (صفحہ ۲۳۴)۔"

مندرجہ بالارائے سے قطع نظر، شاعری ہو یا نثر کی کوئی صنف کچھ نہ کچھ خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں۔ "گئے دِنوں کا سُراغ" میں محاسن و مصائب کا جائزہ لیتے ہوئے درج ذیل اجزاء قابلِ ذکر نظر آئے۔

تصویر کشی:

مظفر وارثی نے اپنی داستان حیات لکھتے ہوئے اپنی یادداشت کی مدد سے ایسی عمدہ تصویر کشی کی ہے کہ قاری اَش اَش کر اُٹھتا ہے۔ بشریٰ فرخ (36) کا ایک شعر ہے

ے سنانے والے کا اس میں کمال ہوتا ہے
کہ بڑھتا جاتا ہے کچھ اور واقعات کا حُسن

اپنے آس پاس بکھرے ہوئے حُسن و جمال کی حقیقی تصویر پیش کرنا، ذہن میں موجود احساسات اور فکر و خیال کی آزادانہ عکاسی اور عناصر و مظاہر کی قدرتی خوب صورتی اور جاذبیت کو من و عن الفاظ کا لبادہ پہنانا تصویر کشی کہلاتے ہیں۔ تصویر کشی داخلی اور خارجی دونوں قسم کی ہوتی ہے۔ اس میں ماورائی اور غیر ماورائی دونوں قسم کے مناظر کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان مناظر میں ہجر، فراق، رومانیت کے ساتھ کائنات کے مظاہر موسم، پہاڑ، دریا، سمندر، باغات، پھول پودے اور گردو پیش کے مناظر بھی شامل ہیں۔ اپنی جائے پیدائش کے بارے میں وارثی (37) کس طرح تصویر کشی کرتے ہیں:-

"جہاں ہماری پیدائش ہوئی تھی پہلے شاہ گھاسہ پھر سرائے بہلم، ریلوے اسٹیشن سے شہر میں داخل ہونے کے بعد گھنٹے گھر کے دروازے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی اصل حالت میں موجود ہے۔ یہ بہت بارونق علاقہ ہے۔

اناج منڈی اور گھنٹہ گھر کے درمیان دائیں جانب ویلی بازار ہے۔ نیچے دکانیں ہیں اور اوپر طوائفوں کے کوٹھے۔ ایک بازار نیچے اور ایک اوپر، ایک دن کو کُھلتا ہے ایک رات کو۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں مظفر وارثی نے کس قدر باریکی سے اپنی جائے پیدائش کی عکاسی کی ہے کہ قاری خود کو اس منظر میں متحرک دیکھنے لگتا ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ وارثی (38) اپنے والد صاحب کی علامہ اقبال سے ملاقات کے احوال لکھتے ہیں:-

"ایک دفعہ وہ اپنے مریدوں کے ساتھ لنڈا بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک کار ان کے قریب آکر رُکی ڈرائیور کی سیٹ سے ایک صاحب گاڑی سے اُترے اور نہایت محبت بھرے لہجے میں ادب سے والد سے کہا "گاڑی میں تشریف رکھیے!" اُنھوں نے مریدوں کو رخصت کیا اور ان کے ساتھ چلے گئے۔ پچھلی سیٹ پر ان کے ساتھ دین محمد کتب فروش بیٹھے تھے جنھیں وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ ان سے آہستگی سے پوچھا کہ یہ صاحب کون ہیں؟ انھوں نے بتایا، "علامہ اقبال۔"

۲۷۰ صفحات پر مبنی اس آپ بیتی میں ہمیں مرقّع کشی کی شان دار مثالیں جگہ جگہ بکھری نظر آتی ہیں۔

جزئیات نگاری:

شاعری یا افسانے میں کسی واقعے یا منظر کو بیان کرتے وقت اس کے انتہائی معمولی حِصہ کو بھی مدِ نظر رکھنا "جزئیات نگاری" کہلاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات اور کرداروں کی معمولی حرکات و سکنات بھی لکھنے والے کی نظر میں ہوتے ہیں۔ مصنف کا قلم نہایت مضبوط طریقے سے ان کی تفصیل بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ انداز قاری کو پوری طرح گرفت میں لے لیتا ہے اور تحریر میں اُس کا انہاک اور تجسّس بڑھتا چلا جاتا ہے۔ "گئے دِنوں کا سُراغ" جزئیات نگاری کی اِنھی خصوصیات سے مال مال ہے۔ وارثی (39) دہلی میں مرزا غالب کی قبر پر جاتے ہیں تو احوال سُنیے:-

"ہم پہنچے تو مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے احاطے میں قبر اور قبر جتنا گنبد ہے ۔شمال میں قبر کے ساتھ غالب کی اہلیہ کی قبر ہے۔ قبر پرنے پروانہ پرسوزدنے گلے کا سماں تھا۔ چراغ اور پھول تو کیا ہوتے، احاطے میں کچھی چرسی لَوٹ رہے تھے یا کُتے۔ دُکھ بھی ہوا اور سوچ میں پڑ گئے کہ غالب اور اقبال ایک ہی جیسے معیار کے شاعر ہیں لیکن ایک کی قبر پر

> یہ ویرانی ہے اور ایک کی قبر پر شاہانِ وقت پھول چڑھاتے ہیں۔ دوسرے لمحے ہمارے ہی ذہن نے جواب دیا "فرق صرف عشقِ رسول ﷺ کا ہے۔"

منظر نگاری میں مہارت اُسی وقت ہو سکتی ہے جب جزئیات نگاری کا خیال رکھا جائے۔ "کراچی کا نعتیہ مشاعرہ" کی ذیل مظفر وارثی (40) رقطراز ہے:-

> "صبح چار بجے کے لگ بھگ ہماری باری آئی۔ مؤذنوں کی صدا سے پہلے ہماری آواز دربارِ رسالت مآب میں گونجی "یا رحمتہ اللعالمین، الہام ہے جامہ ترا۔ قرآن عمامہ ہے ترا، منبر ترا عرشِ بریں، یا رحمتہ اللعالمین"........ایک عجیب تقدس پوری فضا سے لپٹا ہوا تھا۔ ہر آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ ہر آدمی کے پانچویں حواس سماعت بنے ہوئے تھے۔ داد زبانوں سے نہیں دل سے نکل رہی تھی........ناقابلِ بیان منظر آنکھ دیکھ رہی تھی۔ جب کوئی شعر پسند آتا تو لوگ اسے مقرر سُنتے۔ ہم نے نعت ختم کی تو لوگوں نے ہمیں آگھیرا۔"

جزئیات نگاری سے قاری کے سامنے پورا منظر کسی قلمی تصویر کی پھِر جاتا ہے۔ قاری اُسی فضا اور ماحول میں سانس لیتا ہے۔ جزئیات نگاری اسلوب اور بیانیے کا اہم حِصہ ہے۔ اچھی جزئیات نگاری کرداروں اور زبان و بیان کو سمجھنے میں معاون و مددگار ہوتی ہے اور اس سے فن پارے کی ادبی وقعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

وقائع نگاری:

مظفر وارثی نے اپنی آپ بیتی کو واقعات سے سجایا ہے۔ اُن کو جہاں جہاں سے حالات سے مطابقت رکھتے ہوئے واقعات یاد آتے ہیں، وہ درج کر دیتے ہیں جِس سے آپ بیتی میں خشکی پیدا نہیں ہوتی اور واقعات کا تانا بانا دلچسپ انداز میں قاری کو اپنے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔ آپ بیتی کے شروع میں اپنی جائے پیدائش کے بیان میں لکھتے ہیں (41):-

> "نیچے دکانیں ہیں اوپر طوائفوں کے کوٹھے۔ ایک بازار نیچے ایک اوپر، ایک دن کو کُھلتا ہے ایک رات کو، قاتل تمیزن کا مشہور واقعہ بھی یہیں کا ہے۔ ایک نواب صاحب تمیزن طوائف کے عشق میں مبتلا ہو کر اسے بیوی بنا کر گھر لے گئے۔ طوائف کو بیوی بنانا ہوا کے جھونکے کو پنجرے میں رکھنا ہے۔

آخر نواب صاحب کو اس کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر اپنی غلطی کی قیمت ادا کرنا پڑی۔"

نثری صنف میں واقعہ اہم عنصر ہے۔ واقعی نگاری میں زمانی ترتیب ضروری ہے۔ پیدائش، لڑکپن، جوانی ، ادھیڑ عمری اور بڑھاپا۔ سکول، کالج اور پھر یونیورسٹی۔ قصہ پن کسی بھی صنف کو دل چسپ بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مظفر وارثی نے جگہ جگہ اپنی یادداشت سے کام لے کر اپنی زندگی کے یادگار واقعات کو اپنی خودنوشت کا حِصہ بنایا ہے۔ "ہم اور پاکستان عوامی تحریک" کے باب میں وارثی (42) ایک واقعہ لکھتے ہیں:-

"فرمانے لگے، وارثی صاحب! بے نظیر تو ہے ہی کُھلی بے دین، منافق نواز شریف ہے اور منافق زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ طاہر صاحب منافق اسے کہہ رہے تھے جو اپنے کاندھوں پر بٹھا کر انھیں غارِ حرا تک لے گیا گیا۔ جو لوگ جا چکے ہیں جانتے ہیں کہ اپنا وجود لے کر اس پہاڑ پر چڑھنا مشکل ہے چہ جائیکہ کسی کو کندھوں پر لاد کر۔"

بے ساختہ پن:

خودنوشت "گئے دِنوں کا سُراغ" میں بے ساختہ پن شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ مظفر وارثی لکھتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں کہ برمحل جملے خودبخود اُن کی نوکِ قلم سے ادا ہونے لگتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

- پتھری نے سب کچھ پتھرا دیا۔ (ص ۴۲)
- جیسے ہی سورج غروب ہوتا ہم بھی ڈوبنے لگتے۔ (ص ۲۶)
- ہم میٹھے سے نہیں پرہیز سے پرہیز کرتے ہیں۔ (ص ۲۶۴)
- ہم نے سارے قرضے اُتارے اور پھر ہاتھ کے خالی اور دل کے قلندر کہلانے لگے۔ (ص ۱۷۶)
- تیرہ ماہ میں وہ ہمارے سامنے تیرہ انچ کے بھی نہیں رہ گئے تھے۔ (۱۷۶)
- پیشانیوں پر نفرتوں کے اشتہار پڑھے ہیں۔ ص (۱۲۶)
- ہماری بھُول کو پھُول اُنھوں نے لگائے ہیں۔ (ص ۱۲۷)
- پیالہ چھِنا نہیں ہم نے خود توڑا تھا۔ (ص ۱۲۷)
- کچھ باتیں انسان کرتا مذاق میں، ہوتی سنجیدہ ہیں۔ (۱۲۷)
- پردے ہٹتے گئے دوست گھٹتے گئے۔ (ص ۹۹)
- ہم پُرانے سال کا کلینڈر تھے، وہ نئے خلیفوں کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ (۱۵۷)

ضرب الامثال اور محاورات کا استعمال:

محاورات، روز مرہ اور ضرب الامثال کو زبان کے زیور کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ان سب کی مدد سے سادہ لو بات کے ساتھ کام کی بلاغت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ اشعار مصرعے، فقرات یا جُملے جو اپنے اندر مکمل ادا معنی چند ہوں اور عوام و خواص کی زبان پر چڑھ گئے ہوں، کہاوت یا ضرب المثل کہلاتے ہیں۔ خود نوشت "گئے دِنوں کا سُراغ" میں جابجا ان محاوروں اور ضرب الامثال سے کام لیا گیا ہے۔

جیسی روح ویسے فرشتے، ایک دھیلے کے بھی احسان مند نہیں، ہر چند کہ ہاتھی کے کھانے والے کچھ اور ہیں، دوسروں پر کیچڑ اُچھالنا، دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہونا، تنگ آمد بجنگ آمد، حق، حقدار رسید، ہمارے گھونسلے میں ماس کہاں، غیر نے سر پیٹ لیا، چوراہے پر گولی کھانے کو تیار ہوں، دنیا بھر کی خاک چھانے گا، سخنوری طرّہ آیا سمجھیے، جلی کٹی سُنانا، چھاج سی داڑھی، پھوٹ میں صورت، گنگا جمنی پیوند، پر تڑوں کا رئیس، بھڑک اُٹھے، رونی صورت، خون کے پیاسے اور اس جیسے سینکڑوں محاورے مظفر وارثی نے اپنی خود نوشت میں استعمال کیے ہیں۔

تعلّیٰ:

اس خود نوشت کا تجزیہ کریں تو خود نمائی کی زیریں تہ غالب نظر آتی ہے جسے بظاہر فقرا اور درویشی کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ پروازی (43) کہتے ہیں:

> "مظفر وارثی کی خود نوشت ایک ایسے انانیت بھرے شخص کی خود نوشت ہے جِسے اپنے سوا ہر شخص چھوٹا نظر آتا ہے اور وہ خود ایسا قد آوار ہے کہ کوئی اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ ٹائٹل پر سورج مکھی کی تصویر ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ چڑھتے سورج کی طرف اپنا رُخ رکھتا ہے۔"

اپنے شاعرانہ رُتبے کا اُنھیں ایسا زعم ہے کہ کہ اُنھوں نے اپنے ہم عصر شعراء کی باقاعدہ مثالیں دے کر یہ بات ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ وہ ان کے حاسد اور خوشہ چیں تھے۔ ایک باب "سرقہ توار داستفادہ" میں اُنھوں نے بہت سے اشعار درج کیے ہیں جِن کی گونج اُنھیں دوسروں میں سُنائی دیتی ہے۔ احمد ندیم قاسمیؔ، احمد فرازؔ، منیر نیازی، محسن بھوپالی، مرتضیٰ برلاس، خالد احمد، امیر فاضلی، سلیم کوثر، امجد اسلام امجد ایک طویل فہرست ہے جو اِن کی ٹانگ کھینچتے تھے۔ منیر نیازی کو تو سوائے انھیں گالیاں دینے کے کچھ آتا ہی نہ تھا (ص ۱۳۱)۔ مرتضیٰ برلاس سر سے پاؤں تک

کڑوے ہو گئے (ص۱۱٦) ہم نے اپنی کلیات کے کچھ آرا جمع کرنا چاہیں۔ بہت سے لوگوں نے بہت کچھ لکھا، نہیں لِکھا تو ندیم اینڈ کو نے نہیں لکھا (ص۱۰۲) وارثی صاحب آپ کو تو یہ بات بھی نہیں معلوم ہو گی کہ دو مرتبہ آپ کو پرائڈ آف پرفارمنس کے لیے چُنا گیا لیکن ایوارڈ آپ کو نہین ملا، اس کا سہرا جناب احمد ندیم قاسمی کے سر ہے (ص۱۱۰) زلفی اہل تشیع لیکن اتنے تنگ نظر ہوں گے اس کا اندازہ نہ تھا (ص۱۳۹) بھٹو پاکستان کے نہیں بھارت کے وزیراعظم تھے۔ جس شخص کو دشمن ملک میں اتنی پذیرائی ملی وہ پاکستان کا دوست کیونکہ ہو سکتا تھا (ص۱۴۵) بے نظیر صاحبہ کی وزارتِ عظمیٰ کا پہلا دَور ہو یا دوسرا، انتقام سرِ فہرست رہا (ص۱۵۹) حفیظ جالندھری میں انا کوٹ کوٹ کر بھری تھی (ص۸۷)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُن کے عہد میں کوئی اچھا آدمی بھی تھا؟ سب اُن سے حسد کرتے تھے، اُن کی ترقی کا راستہ روکنے والے تھے؟ بلکہ اُن کا ہی ایک شعر ہے (44)

ے یار تو سب ہی میرے دشمن نکلے
دشمنوں میں میرے، کوئی میرا یار بھی ہے

ڈاکٹر پروازی (45) کے مطابق:-

"ترنم اللہ نے اچھا دیا تھا اس لیے مشاعروں میں پہلے ابا کی غزلیں گا کر پڑھتے تھے اور داد سمیٹتے تھے، پھر اپنی غزلیں پڑھنے لگے۔ ابا سے وارثی ہونا بھی ورثہ میں پایا اس لیے نعتیں کہنے لگے اور ضیاالحق کے زمانے میں جب نعتیں کہنا لوگوں کا پیشہ بن گیا تو اُن کے وارے نیارے ہو گئے۔ یہ نہ صرف نعت گو تھے (نعت خواں بھی بن گئے) اور اپنی نعت کو بالکل اچھوتی آواز، نیا اسلوبِ فکر، نئی ہیئت، نئی تشبیہ استعارات، نئی لفظیات کا حامل کہنے لگے۔"

آپ بیتی میں اخفائے ذات اور انکشافِ ذات کا توازن برقرار رکھنا ہر ادیب کا کمال نہیں۔ مظفر وارثی نے بھی "ہم" کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے احساسِ برتری کے نئے دَر وا کیے ہیں۔ سماجی حوالوں سے جائزہ لیا جائے تو یہ آپ بیتی "وارثی نامہ" محسوس ہوتی ہے۔ چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:-

- کِس کِس مشاعرے کی کامیابی کا سہرہ اپنے سر پر باندھیں۔ (۲۲۲)
- قدرت ہم سے کام لینا چاہتی ہے۔ (۱٦۸)
- سنیل دت نے کہا کہ مظفر وارثی ہندوستان پاکستان کے شاعر نہیں، عالمی شاعر ہیں۔ (۲۰۸)

تعلّی کے حوالے سے ہی وارثی (46) کا شعر ملاحظہ ہو

رہوں گا زندہ میں اپنی تخلیق میں مظفرؔ
میرے ہر اک لفظ میں پیامِ نمود ہو گا

بقول قریشی (47):

"نعت عَصرِ نَو کا مرکزی جوہر ہے۔"

اس بات کو اگر سامنے رکھا جائے تو نعت کی اہمیت مسلّم ہو جاتی ہے اور مظفر وارثی جو نعت گو کے ساتھ نعت خواں بھی تھے تعلّی اُن کا حق بنتا ہے۔

مظفر وارثی کا ذخیرہ الفاظ اور نوعیّت:

نثری اسلوب کا اپنا ایک منفرد آہنگ ہوتا ہے۔ یہی آہنگ تحریر میں سلاست پیدا کرتا ہے۔ بعض قلم کاروں کے ہاں جُملوں کی مصنوعی اور پُر تکلف فضا تحریر میں روانی کو متاثر کرتی ہے۔ مصنوعی اسلوب دیر تک نہیں چل سکتا۔ جُملے کی چُستی اور دَروبست اسے ابلاغ کے قریب ترین کرتا ہے۔

مظفر وارثی کی نثر اس لحاظ سے نقائص سے پاک ہے۔ اُنھوں نے جُملے کو لمبا اور پیچیدہ نہیں ہونے دیا۔ "گئے دِنوں کا سُراغ" آپ بیتی میں نجی، جذباتی، روحانی، تاریخی، دفتری، عملی، تخیّلاتی، ادبی اور نظریاتی ہر قسم کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ خود نوشت میں ضیاالحق، بے نظیر اور نواز شریف سے لے کر معمولی حلال خور تک کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ مظفر وارثی کے منفرد طرزِ تحریر اور دل نشیں اندازِ بیاں کا اعجاز ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعات اور معمولی سطح کے افراد بھی قاری کے دل و دماغ میں اپنی لفظیات کے سبب سما جاتے ہیں۔ مظفر وارثی کی تحریر کی ایک خوب صورتی یہ ہے کہ اُنھوں نے جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور کردار نگاری کے دوران نازک ترین خیالات، مشکل ترین معاملات اور پیچیدہ ترین مفاہم کو پورے تاثر کے ساتھ سہولت سے قلم بند کیا ہے۔ ڈاکٹر عامر سہیل (48) اپنی تصنیف "جدید لسانیاتی اور اسلوبی تصورات" میں لکھتے ہیں:-

"دنیا کی ہر زبان تین بنیادی اسالیب کی حامل ہوتی ہے جن کو ہم اطلاعی، ہدایتی اور اظہاری اسلوب کا نام دیتے ہیں۔ ان اسالیب کو جب لسانی اعتبار سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے (تخلیقی متون کے حوالے سے) تو اس میں زبان کے صوتی، حرفی، نحوی، معنیاتی اور لغوی سطح کی جانچ پرکھ شامل ہو جاتی

ہے۔ یہ سارا جائزہ اس وقت مکمل ہوتا ہے جب کسی تخلیق کار کے ادبی متون
میں موجود ذخیرہ الفاظ کی نوعت کو سمجھ لیا جائے۔"

مظفر وارثی کی خود نوشت "گئے دِنوں کا سُراغ" کے مطالعے کے دوران ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے عصرِ حاضر کی مروج زبانوں سے حتی المقدور استفادہ کیا ہے جن میں اردو کے علاوہ ہندی، فارسی، پنجابی، عربی اور انگریزی کا لفظی ذخیرہ موجود ہے۔ مثال کے طور پر کچھ الفاظ ملاحظہ کیجئے:

ہندی الفاظ:

قشقہ، آرتی اُتارنا، چرن چھُونا، آشیر واد لینا، بھگوان، درشن، سنگھاسن۔

فارسی الفاظ:

دفینہ، شاطر، اتالیق، جوانِ رعنا، عدم مناکجت، بست وکشاد، بپتا، گل افشانی، یاداش، ہدف، آفریں، ناگفتہ بہ۔

پنجابی الفاظ:

ٹیڈی پیسہ، گارا، مٹی، ڈھونا، کُھر پھُسر، ڈھنڈورا، بھانڈے۔

عربی الفاظ:

واللہ الحکم، صراطِ حق، سجدہ سہو، رحمتہ للعالمین، جانب بطحا، حلال، جہاد۔

انگریزی الفاظ:

میرٹ، ایگسیٹ، گیسٹ روم، مارشل لاء، خفیف، باس، سینئر، جونئیر، نوٹ کرانا، شوگر، پارٹی بیبٹ، ایڈمنسٹریٹر، برائٹ۔ خود نوشت کا گہری نظر کا جائزہ لیا جائے تو مصنف کے اسلوب پر الگ سے باب لکھا جاسکتا ہے کیونکہ اُنھوں نے اپنی تحریر میں مقامی اور آفاقی ہر قسم کے الفاظ استعمال کیا ہے۔ فارسی تراکیب، عربی آیات اور انگریزی کے الفاظ کو قادرالکلامی سے مظفر وارثی نے اپنی تخلیق کا حصہ بنایا ہے۔

گو صنتعیں شاعری کے لیے استعمال کی جاتی ہیں لیکن مظفر وارثی نے اپنے اسلوب سے کام لے کر اپنی نثر میں ان کا استعمال کیا ہے۔ صنعت استفہام میں سوال اُٹھایا جاتا ہے، صنعت تعجب بھی اس سے ملتی جُلتی ہے جس میں شعر میں کوئی تصور پیش کرتے ہوئے حیرانی اور تعصب کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل میں صنعت کی مختلف اقسام دی جا رہی ہیں۔

صنعت تضاد سے مراد اُلٹ کے ہیں ایک مصرعے میں پیش کردہ چیز کے بالکل مخالف دوسرے مصرعے میں پیش کردہ چیزوں کے ذکر کرنے کا نام صنعت تضاد ہے جیسے:-

- ہم بکھرے تو موصوف کچھ سمٹے۔(۲۰۹)
- دبلا پتلا لیکن چٹان کی طرح(۱۹۰)
- ہماری ایک آنکھ پھوٹی لیکن اگلے کی دونوں پھوٹ گئیں۔(۱۹۱)
- اعتراف میں اِنکار کی آفر(۱۹۴)

- اُنھوں نے تکرارِ لفظی کے ذریعے بھی اپنی نثر کو دلکشی عطا کی ہے۔ لفظوں کے جوڑے بنا کر ترنم اور موسقیت پیدا کرنے کا نام تکرارِ لفظی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں:
- یوں ہی گونجتا رہوں گا گلی گلی مظفرؔ۔

میرا شہر شہر بسیرہ میرے بعد تک رہے گا۔

- پتھری نے سب کچھ پتھرا دیا۔
- تیرہ ماہ میں وہ ہمارے سامنے تیرہ انچ کے بھی نہ رہے۔
- قہر درویش بر جان درویش
- پہلوانوں کے شہر میں سخن کے پہلوان بلوائے گئے تھے۔

"گئے دِنوں کا سُراغ" ایک اچھی خود نوشت ہے جِس میں نعت گو، غزل گو اور نعت خواں مظفر وارثی نے اپنی زندگی کے حالات و واقعات کا اندراج کیا ہے۔ فنی اور فکری دونوں لحاظ سے یہ سر گزشت اپنے عہد کی عکاسی اور امین ہے۔ مظفر وارثی کی مفرّس و معرّب اسلوب روز مرہ محاوروں، آیات اور مصرعوں پر مبنی ہے۔ اُن کی آپ بیتی میں ایک عہد سمٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے وقت کے سیاسی قائدین کی سچی تصویریں قاری کے سامنے پیش کر کے اپنا ملّی فریضہ سرانجام دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وارثی، مظفر (۲۰۰۰ء)، گئے دِنوں کا سُراغ، لاہور، خزینہ علم و ادب، ص ۱۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۴

۳۔ ایضاً، ص ۲۵

۴۔ ایضاً، ص ۴۲

۵۔ ایضاً، ص ۴۷

۶۔ ایضاً، ص ۴۹

۷۔ ایضاً، ص ۵۸

۸۔ ایضاً، ص ۵۵

۹۔ ایضاً، ص ۵۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۷۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۸۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۶

۱۵۔ احمد، شہزاد (۲۰۰۰ء) بحوالہ مظفر وارثی اور ان کی شاعری (رضیہ سلطانہ سحر)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ص ۱۴۶

16۔ سُرور، آل احمد (۱۹۹۴ء)، خواب باقی ہیں، لاہور، فکشن ہاؤس، ص ۸

17۔ قاضی، صبیحہ انور، (۱۹۸۲ء)، اردو میں خود نوشت سوانح حیات، لکھنؤ، نامی پریس، ص ۳۴۹

18۔ حسین، مجتبیٰ، (۱۹۹۷ء)، سر گزشت (مشمولہ: مشتاق احمد یوسفی، چراغ تلے سے آب گُم تک) مرتبہ حسیب، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ص۱۸۸

19۔وارثی، مظفر (۲۰۰۰ء)، پیش آہنگ (مشمولہ: گئے دِنوں کا سُراغ) محولہ بالا، ص۱۳

20۔وارثی، مظفر (۲۰۰۰ء)، محولہ بالا، ص۱۵

21۔ ایضاً، ص۵۱

22۔ ایضاً، ص۸۲

23۔ ایضاً، ص۵۷

24۔ ایضاً، ص۱۸۰

25۔ ایضاً، ص۱۶۹

26۔ ایضاً، ص۶۵

27۔ احمد، نبی، (س،ن)، اردو غزل میں ہجرت کا تجربہ، اسلام آباد، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون سائنس اور ٹیکنالوجی، ص۱۱۳

28۔وارثی، مظفر (۲۰۰۰ء)، محولہ بالا ص۹۳

29۔ ایضاً، ص۹۸

30۔ ایضاً، ص۶۶

31۔پروازی، پرویز، (۲۰۰۳ء)، پس نوشت اور پسِ پس نوشت: خود نوشتوں کا جائزہ، دیباچہ حصہ اوّل، ص۱۳

32۔ داؤد رہبر، (۲۰۰۳ء)، پیش لفظ مشمولہ: پس نوشت اور پسِ پس نوشت، از ڈاکٹر پرویز پروازی، ص۱۶

33۔پروازی، پرویز، (۲۰۰۳ء) محولہ بالا، ص۱۷

34۔وارثی، مظفر (۲۰۰۰ء)، گئے دِنوں کا سُراغ (پیش آہنگ دیباچہ)، ص۱۱

35۔ پروازی، پرویز،(۲۰۰۷ء)، محولہ بالا، ص۴۸۵

36۔ فرخ، بشریٰ،(۲۰۲۲ء)، لڑکیاں بند کتابوں جیسی، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، ص۳۱

37۔ وارثی، مظفر،(۲۰۰۰ء)، محولہ بالا، ص۲۴

38۔ ایضاً، ص۳۳

39۔ ایضاً، ص۲۳۸

40۔ ایضاً، ص۱۹۸

41۔ ایضاً، ص۲۴

42۔ ایضاً، ص۱۷۲

43۔ پروازی، پرویز،(۲۰۰۷ء)، پس نوشت اور پسِ پس نوشت، لاہور، نیازمانہ پبلی کیشنز، ص۴۸۹

44۔ وارثی، مظفر(۱۹۹۳) کھلے دریچے بند ہوا، لاہور، القمر انٹرپرائزرز، ص۲۰۲

45۔ پروازی، پرویز،(۲۰۰۷ء)، محولہ بالا، ص۴۸۶

46۔ وارثی، مظفر،(۱۹۹۳ء)، کُھلے دریچے بند ہوا، لاہور، القمر انٹرپرائزز، ص۲۲۱

47۔ قریشی، جاذب،(۲۰۱۲ء)، عہدِ جدید کی نعت نگاری(مشمولہ: ادب کے تنقیدی نقوش)، کراچی، نعت ریسرچ سنٹر، ص۲۴۳

48۔ عامر سہیل،(۲۰۲۱ء)، جدید لسانیاتی اور اسلوبی تصورات، فیصل آباد، مثالی پبلشرز، ص۲۷۸

باب سوم

"صبح کرنا شام کا" از آفاق صدیقی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

فصل اول	آفاق صدیقی کی سوانح اور شخصیت
فصل دوم	"صبح کرنا شام کا" موضوعاتی جائزہ
فصل سوم	"صبح کرنا شام کا" فنی اور اُسلوبی جائزہ

فصل اول

آفاق صدیقی کی سوانح اور شخصیت

تعارف:

شاعر، ادیب، محقق، ناقد، صحافی، انشاپرداز، افسانہ نگار، ماہر لسانیات، مترجم اور اردو کے ساتھ ساتھ پاکستان کی بعض علاقائی زبانوں سے علمی و ادبی وابستگی رکھنے والی شخصیت، پروفیسر آفاق صدیقی اپنے عہد کی ایک بہت محترم اور معتبر شخصیت شمار کیے جاتے ہیں۔ آفاق صدیقی ۴ مئی ۱۹۲۸ کو مینپوری (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آباؤاجداد شیخ پور ضلع فرخ آباد کے رہنے والے تھے لیکن آفاق صاحب کے والد مولوی محمد اسحاق ملازمت کی وجہ سے زیادہ تر مینپوری میں رہے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ ہجرت کر کے پاکستان کے شہر کراچی میں آ گئے۔ وہ ایک شخصیت نہیں بلکہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ علم اور تہذیب اس انجمن کی پہچان ہے۔ آفاق صدیقی صاحبِ زبان تھے لیکن فارسی اور سندھی پر بھی اُنھیں دسترس تھی۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے اپنے لیے تحقیق اور ترجمے کی مشکل راہ اختیار کی۔ آفاق صدیقی کے کام کو سندھی اور اردو ادب کے لیے اہم خیال تصور کیا جاتا ہے۔ آفاق صدیقی نے سچل سرمست، شیخ ایاز اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سندھی شاعری کے اردو میں تراجم کیے ہیں۔ آفاق صدیقی کا شمار اُن مشہور و معروف شخصیات میں ہوتا ہے جو کسی مخصوص حوالے کے ساتھ ایسے مرتبے پر فائز ہوتی ہیں، جہاں انھیں تفصیلی تعارف کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ علم و ادب اور درس و تدریس کے حوالے سے آپ کی گراں قدر خدمات نصف صدی سے زیادہ عرصے پر پھیلی ہوئی ہیں۔ خود آفاق صدیقی کا ہی شعر اُن کی خودنوشت میں شامل ہے:-

اسیر فکر و نظر ہے ہر آدمی آفاقؔ
کوئی زمیں کی طرح کوئی آسماں کی طرح

خاندانی پس منظر:

آفاق صدیقی کے دادا کا نام محمد ابراہیم تھا۔ محمد ابراہیم کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑے بیٹے کا نام اسحاق اور چھوٹے کا نام یعقوب تھا۔ اسحاق، آفاق صدیقی کے والد تھے جو صرف طبعاً بھولے بھالے نہیں بلکہ پکارے بھی "بھولے میاں" کے نام سے جاتے تھے۔ صدیقی (۱) اپنی خودنوشت "صبح کرنا شام کا" میں لکھتے ہیں:-

> "ویسے نام تو اسحاق تھا اور گاؤں میں وہ للو بھیا کہے جاتے تھے۔ میں نے شروع میں ان کو بُھلّا کہا اور جب بڑا ہو گیا تو ابّا کہنے لگا۔"

آفاق صدیقی بتاتے ہیں کہ شیخ پور میں نیم، املی اور آم کے درختوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ ساون رُت میں ان پیڑوں پر جھولے ڈال کر پینگیں چڑھائی جاتیں۔ اِن میں لڑکے اور لڑکی کی کوئی تخصیص نہ ہوتی۔ ابا بتاتے تھے کہ وہ جھولا جھولنے کے بڑے رسیا تھے لیکن وہ جب بھی جھولا جھول رہے ہوتے ایک شریر لڑکی آکر پیچھے سے زور دار چُٹکی بھر کر بھاگ جاتی۔ یہ بلبلا کر رہ جاتے۔ ایک دوسری لڑکی آکر اُن سے ہمدردی کا اظہار کرتی اور اکثر بدلا لینے کے لیے اُس شریر لڑکی کے پیچھے بھاگ کھڑی ہوتی۔

ابا کہتے ہیں جوان ہوئے تو اُسی ہمدرد لڑکی سے شادی ہو گئی حالانکہ میں چُٹکی کاٹنے والی لڑکی کو پسند کرتا تھا۔ شادی کے بعد دونوں میاں بیوی ضلع مین پوری کے ایک تھانے میں رہنے لگے اور یہیں ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جِس کا نام محمد اشفاق رکھا گیا۔

صدیقی (۲) بتاتے ہیں کہ ضلع مین پوری کے تھانے میں میرے والد کی سرکاری نوکری تھی اور ایک دن جب وہ سرکاری دورے پر گئے ہوئے تھے اور محمد اشفاق عرف مُنے میاں کھیلنے میں مگن تھے۔ اُن کی اماں باورچی خانے میں روٹیاں پکانے میں مگن تھیں کہ آندھی کی وجہ سے آگ بھڑک اٹھی جس نے آن کی آن میں اُن کو جُھلسا ڈالا۔ ماں اور بچے کی پکار سُن کر آس پڑوس کے لوگ مدد کو دوڑے۔ رات گئے جب شوہر دورے سے واپس آئے تو شریکِ حیات کو قریب المو ت پایا۔ وہ اُنھیں لے کر آگرہ پہنچے لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ دوسری طرف وہ چٹکی کاٹنے والی لڑکی بھی بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی۔ ایک بیٹی اُس کی آرزوؤں کا مرکز تھی۔ پیر و مرشد سیّد احسن علی شاہ کے سجادہ نشین سیّد محمود میاںؒ نے اپنے مریدِ خاص سے عقدِ ثانی پر رضامند کیا۔ ۱۹۲۶ء میں یہ کارِ خیر انجام پذیر ہوا۔ وہ (۳) کہتے ہیں:-

"قدرت خدا کی، دوسری شادی اس شخص سے ہوئی جسے یہ جھُولے سے ہٹانے کے لیے نوچ کر بھاگ جاتی تھیں۔"

شادی کے بعد دوبارہ مین پوری جابسے جہاں آفاق صدیقی کے والد کی پہلے سے ہی ملازمت تھی۔ ۴ مئی ۱۹۲۸ء میں آفاق صدیقی پیدا ہوئے۔ وہ (۴) کہتے ہیں:-

"نازبرداری کرنے والوں میں والدین کے علاوہ ایک بھائی اور ایک بہن پہلے سے موجود تھے۔ سگے اور سوتیلے کی کوئی تفریق مجھے تو محسوس نہ ہوئی۔"

محمد آفاق صدیقی ان کا پورا نام قرار پایا۔ آفاق صدیقی کی والدہ کا دل شہر مین پوری سے اچاٹ ہوا تو وہ بچوں کو لے کر اپنی والدہ کے پاس شیخ پور آ گئیں۔ آفاق صدیقی کی والدہ کے دل میں پہلے شوہر کی وفات کا صدمہ کم نہ ہوا

تھا۔ لہٰذا وہ جسمانی طور پر اس قابل نہ تھیں کہ اپنے بیٹے کی پرورش کر سکتیں۔ اس موقع پر رشتے دار محمود میاں (مرشد سیّد احسن علی شاہ کے سجادہ نشین) کی بیگم "ودا" نے آفاق صدیقی کو گود لے لیا اور پرورش کی۔ صدیقی (۵) کے مطابق:۔

"محمود دادا بھی مجھے بہت عزیز رکھتے تھے وہ میرے ابا کے پیر و مرشد ہی نہیں قریبی رشتے سے ماموں بھی تھے۔"

بڑے اہتمام سے آفاق صدیقی کی "بسم اللہ" کی رسم کا اہتمام کیا گیا۔ محمود میاں کی والدہ (بڑی پیرانی) نے پھولوں کے ہار پہنائے اور ماتھا چوم کر صدقہ اُتارا۔

بچپن کے واقعات کے بارے میں آفاق صدیقی اپنی آپ بیتی "صبح کرنا شام کا" میں بتاتے ہیں کہ میرے لیے گاؤں میں بڑی کشش تھی۔ یہاں مخدوم میاں صاحب کا میلہ ہوتا یا احسن میاں کا عرس۔ ان دونوں میں شرکت کے لیے بنگال اور آسام تک سے مہمان آتے۔ وہ (٦) کہتے ہیں:-

"قوالوں کی ٹولیاں بھی دور دور کے شہروں سے آئیں جن کی گلوکاری نے
بچپن سے موسیقی کا گرویدہ بنادیا۔"

دلی کے حکیم محمد احمد رئیس آدمی تھے۔ اُن کا آنا بچوں کے لیے بابرکت ہوتا کیونکہ وہ اپنے ذاتی ملازمین کے ساتھ گاڑی میں تشریف لاتے۔ اُن کے پاس بہت سی پیسوں کی تھیلیاں ہوتیں جو وہ روزانہ بچوں میں بانٹا کرتے اور یوں بچوں کے مزے ہو جاتے۔ میلے میں لطیفہ گو شفیع خاں کے علاوہ دہلی کے داستان گو، تال گرام کے بھانڈ، ترموہن کی نوٹنکی والے اور مختلف شہروں سے گانے والیاں گاؤں والوں کے لیے بڑی دل چسپیاں پیدا کرتیں۔ البتہ فلم دیکھنے کے لیے فرخ آباد جانا پڑتا تھا۔ شیخ پور کے آس پاس امان آباد، غوث پور، دیوراج پور، سریا اور حیرا گو کے گاؤں تھے ان علاقوں میں بھی شادی بیاہ اور خوشی کے مواقع پر رنگارنگ تفریحی پروگرام ہوتے تھے۔

والدین اور بہن بھائی:

آفاق صدیقی کی والدہ اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھیں۔ خود اسحاق صاحب کی بھی یہ دوسری شادی تھی۔ اُن کی پہلی بیوی آتشزدگی کے دوران چل بسی تھیں۔ والدہ کی پہلے شوہر سے ایک بیٹی (خوشنودی آپا) اور والد کی پہلی بیوی میں سے ایک بھائی (محمد اشفاق) تھے۔ چونکہ آفاق صدیقی کو ٹھیک سے اپنی ماں کا پیار نہیں ملا تھا۔ اس لیے ان کے والد اپنے سرکاری فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دل جوئی بھی کرتے۔ چھے برس کی عمر میں سکول جانے

لگے تو بڑے بھائی محمد اشفاق انھیں اپنے ساتھ لے جاتے۔ رفتہ رفتہ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی اور وہ خود سکول جانے لگے۔

آفاق صدیقی اپنی والدہ کی پہلی شادی میں سے بیٹی خوشنودی آپا سے بہت پیار کرتے تھے۔ اُن کی شادی ہوئی تو رخصتی کے وقت اِن کی حالت اتنی غیر ہو گئی کہ بلآخر دولھا والے اِنھیں بھی اپنے ساتھ فرخ آباد لے گئے۔ خوشنودی آپا ڈھائی سال کے بعد انتقال کر گئیں۔ والد پورے گھرانے کو لے کر فرخ آباد پہنچے تو آفاق صدیقی کی والدہ ہوش و حواس کھو بیٹھیں۔ ان پر کئی کئی دن مجذوبانہ کیفیت طاری رہتی، اس دوران وہ اپنے پیر و مرشد سیّد احسن میاں کے مزارِ اقدس پر متواتر بیٹھی رہتیں اور بالآخر سنبھل جاتیں۔

آفاق صدیقی کے والد طبعاً زندہ دل تھے۔ لطیفے، برجستہ اشعار اور دل چسپ قصے سُنا کر خوش ہوتے۔ لیکن جب آفاق صدیقی چوتھی جماعت میں تھے، اُنھوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی۔ اس کی وجہ والدہ کی ناسازی طبع تھی۔ اسحاق صاحب ایثار پسند، بے انتہا پُر خلوص اور سب سے ہمدردی اور پیار سے پیش آنے والے انسان تھے۔ جب تک سرکاری ملازمت اور خوشحالی رہی، حاتم طائی بنے رہے لیکن ناداری نے اِنھیں چُپ سا کرا دیا۔ روکھی سوکھی چلانے کے لیے ماہانہ پنشن تو تھی لیکن اُونٹ کے منھ میں زیرے کے برابر۔ دوسری عالمی جنگ کی ہولناکیوں نے مزید حالات خراب کر دیے۔ گھر کی قیمتی چیزیں بیچ کر اور قرض لے کر اہل و عیال کی بنیادی ضروریات پوری کی جاتیں۔

آفاق صدیقی کے والد خود باسی روٹی، چائے سے ناشتہ کرتے اور اکثر و بیشتر روزدار رہتے۔ دن بھر مشقت کرتے اور رات کو مطالعہ اُن کی عادت تھی۔ صدیقی (۷) کہتے ہیں:-

> "چھوٹے بھائی (یعقوب چچا) کو اپنی قوتِ بازو کہا کرتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں اس قوتِ بازو سے بھی اچانک یوں محروم ہو گئے کہ نمونیہ کے شدید حملے نے اس پیارے بھائی کو چھین لیا۔"

بھائی تو پہلے ہی وفات پا گئے تھے، بڑی بھتیجی انیسہ بیگم کی شادی کو کم و بیش ایک سال ہوا تھا کہ اُس کے سسرال والوں نے جہیز اور زیورات پر قبضہ کر کے اُسے طلاق دے دی۔ یوں اسحاق کی بھاوج اور آفاق صدیقی کی چچی جان کو بیوگی کے ساتھ بیٹی کی بربادی کا دُکھ بھی سہنا پڑا، آفاق صدیقی (۸) کہتے ہیں:-

> ابا کے مصائب و آلام بڑھتے ہی جاتے تھے۔ بڑے کُنبے کی کفالت کا احساس، جوان بھائی کی موت کا صدمہ، بھتیجی کی بربادی کا کرب، اپنی شریکِ حیات کے ذہنی عدم توازن کی الجھنیں اور بڑے بیٹے کی دربدری کا غم۔"

آفاق صدیقی کے بہن بھائیوں میں خوشنودی آپا، محمد اشفاق کے علاوہ تین چھوٹے بھائی اخلاق، اشتیاق اور مختار اور ایک بہن شمیم بھی تھی۔ مرحوم چچا یعقوب کے دو بیٹے ایوب اور یوسف اور تین بیٹیاں انیسہ، نفیسہ اور رئیسہ تھیں۔ آفاق صدیقی بِنا بتائے پاکستان آ گئے۔ ارادہ تھا کہ بعد میں آگاہ کر دوں گا یا جا کر سب کو لے آؤں گا لیکن ۱۹۴۸ء میں والد کی اچانک وفات ہو گئی جس کی اطلاع اِن کو سکھر میں تار کے ذریعے ملی۔ اُن کی وفات کے بعد جلد ہی بڑے بھائی اشفاق اور کچھ دِنوں بعد جوان بہنوئی ایک ناگہانی حادثے کا شکار ہو کر چل بسے۔ اماں اپنے رہے سہے ہوش حواس بھی کھو بیٹھیں اور ایک دن اچانک ایسی غائب ہوئیں کہ پھر کبھی کہیں کسی کو نہ مل سکیں۔

بچپن اور تعلیم:

آفاق صدیقی کے والد کو اپنے اس بیٹے کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما کا بے حد خیال تھا۔ وہ(۹) اکثر کہا کرتے تھے:-

"میرا بیٹا خُوب پڑھ لکھ کر پروفیسر بنے گا۔"

۱۹۳۹ء میں گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر قصبہ کمال گنج کے سرکاری سکول میں آفاق صدیقی کا داخلہ ہو گیا۔ یہاں سکول کے ہیڈ ماسٹر پنڈت گرور لال بہت مہربان رہے۔ وہ آفاق صدیقی کو بیٹے کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ تین سال تک اُنھوں نے اپنی نوازشات کا سلسلہ جاری رکھا، سالانہ امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کی وجہ سے مڈل سکول کی تعلیم کے دوران وظیفہ ملتا رہا۔ قریبی عزیزوں اور بزرگوں میں سبھی کو آفاق صدیقی کی حوصلہ افزائی کا خیال رہتا اور خصوصاً محمود دادا چپکے سے اتنا کچھ دیتے کہ تعلیمی اخراجات کمی بیشی کے ساتھ پورے ہو جاتے۔ خاندان میں دادیوں، چاچیوں، پھوپھیوں، آپاؤں اور چھوٹی بڑی بہنوں کی کمی نہ تھی گڑیا گڈے کی شادی رچائی جاتی تو جہیز اور بارات وغیرہ کے معاملات میں آفاق صدیقی کو آگے آگے رکھا جاتا۔ گویا اُن میں انتظامی صلاحیت موجود تھی۔ ۱۹۴۲ء میں ورنیکلر امتحان میں انھوں نے امتیازی پوزیشن حاصل کی۔ ہائی سکول فتح گڑھ چھاؤنی شیخ پور سے پانچ چھے میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ والد اور دادا محمود میاں نے جیسے تیسے انتظام کر کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ کروا دیا۔ جہاں وہ خود پڑھتے اور دوسروں کو بھی پڑھاتے یوں دو وقت کی روٹی کا انتظام ہو جاتا۔

نویں جماعت میں گورکھ پور (اترپردیش) میں صوبے کے اسکاؤٹس کا بہت بڑا اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں طرحی مشاعرے کا انعقاد بھی تھا۔ مصنفین نے آفاق صدیقی کو اوّل انعام کا حق دار ٹھہرایا۔ ہائی سکول میں بھی اُنھوں نے اوّل پوزیشن لی۔ دوسری جنگ کے خاتمے پر "فوڈ گرین پروکیورمنٹ اسکیم" کا نفاذ ہوا تو انھیں اس میں نوکری مل

گئی۔ ایک سو دس روپے ماہانہ تنخواہ تھی جو چھ مہینے تک ملتی رہی۔ ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ بعد میں ایک سکول میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔

عادات و اطوار:

اسکول سے آنے کے بعد کھانا زیادہ تر چچی کے ہاں تناول کیا جاتا جو باجرے، جوار، موٹھ اور بیسن کی روٹیاں پکانے میں مہارت رکھتی تھی۔ آفاق صدیقی کو گوشت کھانا ناپسند نہیں تھا۔ اس لیے گھر کے صحن میں اُگائی گئی ترکاری سے مدد لی جاتی۔

کبڈی، والی بال اور دوسرے کئی کھیل کھیلے جاتے۔ شام کا کھانا کھا کر درگاہ احسن جو گھر کے پچھواڑے میں تھی وہاں بزرگوں کی مجلس میں شامل ہو اجاتا۔ وہاں حقہ تازہ کرنا اور چلم بھرنا گو آفاق صدیقی کے فرائض میں شامل نہ تھا لیکن اس بہانے ایک آدھ کش کی عیاشی کے علاوہ نذر و نیاز کی شیرینی بھی مل جاتی۔

آواز اچھی تھی سو کبھی کبھار گا کر سُنانے پر محمود دادا کچھ نقدی انعام کی صورت میں عنایت کر دیتے تھے۔ فتح گڑھ کی چھاؤنی زمین دوز ہے اور یہ عہدِ مغلیہ کی یادگار ہے۔ برطانوی راج نے اسے مزید مضبوط، ترقی یافتہ اور مستحکم بنالیا تھا۔ وکٹوریہ گراؤنڈ کے ارد گرد فوجی افسروں کے بنگلے اور بیرکیں تھیں۔ گراؤنڈ میں دن بھر فوجیوں کی پریڈ اور شام کو کئی قسم کے کھیل اور ورزش کے مشاغل ہوتے جن میں نوجوانوں کو بھی شامل کر لیا جاتا۔ فوجیوں کو محاذِ جنگ پر بھیجے جانے کا منظر ناقابلِ فراموش ہوتا۔ وہ ایک عجیب ہی افسردہ کرنے والا منظر ہوتا تھا۔ آفاق صدیقی نے یہ مناظر کئی بار دیکھے۔

تقسیم، فسادات اور ہجرت:

پورے ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں زور و شور سے جاری تھیں۔ آفاق صدیقی نوجوان تھے، جوشیلے تھے اور مسلمان تھے، تحریکِ پاکستان کا نشہ ایسا چڑھا کہ کئی مہینے تک گھر کی صورت تک نہ دیکھی۔ قیامِ پاکستان کی منزل قریب تر ہوئی تو دھواں دار تقریروں اور زوردار نظمیں گلا پھاڑ پھاڑ کر پڑھنے کا ذوق و شوق ٹھنڈا پڑنے لگا۔

اب شہر شہر گاؤں گاؤں کشیدگی سر اُٹھانے لگی۔ آفاق صدیقی بتاتے ہیں کہ میں کئی ماہ بعد گھر آیا تو ابا میاں نے بتایا کہ میرا چھوٹا بھائی اخلاق فوج میں بھرتی ہو کر بنگلور چلا گیا ہے اور اُسی نے بتایا ہے کہ وہ پاکستان جائے گا۔ آفاق (۱۰) بتاتے ہیں کہ:-

"میں نے کہا" پاکستان تو میں بھی جاؤں گا۔" نہیں نہیں ایسا ہر گز نہ کرنا، تم
ہمارے پاس ہی رہنا۔ ابا بہت اُداس ہو گئے اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔"

آفاق صدیقی نے والد سے تو وعدہ کر لیا اور نوکری اور تعلیم جاری رکھنے کے لیے شکوہ آباد چلے آئے۔ دو تین مہینے اچھے گزرے۔ اگست ۴۷ کے آخری ہفتے میں اخلاق نے کراچی سے خط لکھا کہ بھائی ! ابا سے اجازت لے کر پاکستان آجائیں۔ میں ابھی دو تین مہینے کراچی ہوں، ہو سکتا ہے پھر لاہور یا پنڈی چلا جاؤں۔ آپ آئیں گے تو یہاں ملازمت کا بھی بندوبست ہو جائے گا پھر ابا کو بھی خط لکھیں گے کہ سب کو لے کر اِدھر آجائیں۔

آفاق صدیقی نے ہونے والے برادرِ نسبتی اور دوستوں سے مشورہ کیا۔ ابا کے راضی ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ آفاق صدیقی تنِ تنہا آگرہ پہنچے تو خیال تھا کہ تاج محل کو ایک نظر دیکھ لوں۔ صدیقی (۱۱) لکھتے ہیں:-

"لیکن وہاں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ میں سہما سہما لوٹ کر اسٹیشن آگیا کیونکہ اسی رات بمبئی جانا تھا۔ اسٹیشن پر لٹے پٹے اور جان بچا کر بھاگنے والوں کا ہجوم بے پناہ ہو گیا۔ کچھ قتل و خون کی وارداتیں اسٹیشن کی حدود میں بھی ہوئیں۔ مختلف قسم کے المناک واقعات و حادثات کی کہانیاں سُن کر بمبئی جانے والی میل ٹرین میں سوار ہوا جو مسافروں سے بھوسے کی طرح بھری ہوئی تھی۔ چہروں پر خوف و دہشت کی چھاپ اور زبانوں پر ہوش ربا داستانیں اور آہ زاریاں بہت دیکھیں۔ اس لیے کچھ دوسرے نوجوان رضاکاروں کے ساتھ مل کر بچوں، بوڑھوں اور پریشان حال مسافروں کی ممکن حد تک خدمات انجام دیتا رہا۔"

بمبئی پہنچے تو مسلم لیگی رضاکار مہاجرین کو بسوں اور ٹرکوں میں لاد کر باب اللہ ٹینک کے علاقے میں لے گئے۔ اندھیری رات، خوفناک حالات، لیکن اطمینان تھا کہ حفاظتی دستہ ہمراہ ہے۔ عارضی پناہ گاہ میں دردناک مناظر دیکھے۔ کیمپ میں آہ و بقا کی کیفیت میں رات بسر کرنا مشکل ہو جاتا۔ آفاق صدیقی ایک قریبی مسجد میں یادِ اللہ کرتے اور پھر وہیں سو جاتے۔ بمبئی سے کراچی کا سفر بذریعہ بحری جہاز کیا۔ صدیقی (۱۲) کہتے ہیں:-

"بے یار و مددگار کہاں جانا ہے یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ جیسے تیسے جیکب لائن کے ایک جھونپڑے میں پناہ ملی، پردیس اور ناداری، بس کیا بتائیں دن کیسے کٹا اور رات کیونکر گزری۔"

آبادکاری کی ایک لمبی داستان ہے۔ قصہ مختصر پہلی نوکری بنک آف انڈیا میں ملی لیکن بوجہ بیماری نہ ہو پائی۔ پھر ڈاکٹر سلیم الدین احمد صدیقی کے بلانے پر سکھر چلے آئے۔ خرابی صحت کے باوجود یہاں بھی آفاق صدیقی نے

رضاکارانہ سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ سلیم الدین احمد صدیقی پی ڈبلیو ڈی مکینکل ورکشاپ میں ملازم تھے، اُن کی کوششوں سے آفاق صدیقی کو بھی نوکری مل گئی۔ ورکشاپ کے انتظامی معاملات پر فرخ آباد کے کئی پٹھان عرصہ دراز سے ملازم تھے جو ہمدردی میں پیش پیش رہتے۔ رہائش کے لیے سلیم الدین کے گھر کا ایک کمرہ مل گیا، یوں سلسلہ چل نکلا۔ صدیقی (۱۳) اپنی خودنوشت "صبح کرنا شام کا" میں رقم طراز ہیں:-

> "سلیم بھائی جماعتِ اسلامی کے پرانے کارکن تھے۔ اُنھوں نے مجھے اپنے رنگ میں رنگ لیا اور ہم نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کچھ ایسے لوگ دریافت کر لیے جو مولانا مودودی سے عقیدت رکھتے تھے۔ پھر ایک شان دار اجتماع ہوا جس میں مودودی صاحب کے علاوہ مولانا امین احسن اصلاحی اور چند دوسرے مہمان بھی تشریف لائے۔"

آفاق صدیقی بتاتے ہیں کہ سکھر کے گلی کوچوں میں ہر قسم کے سازوسامان کا ڈھیر لگا رہتا۔ لوگ سستے داموں بیچ کر جلد از جلد ترکِ وطن کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں نے ایک پلنگ اور کچھ کُرسیاں خریدیں۔ میں کفایت شعاری سے کام لے کر ہر مہینے پچاس روپے ابا جان کے نام بھیجتا رہا اور ہر ہفتے پابندی سے خط بھی لکھتا رہا۔ لیکن ان کے جو خط میرے نام آتے انتہائی رنج و غم میں ڈوبے ہوتے۔ جنوری ۴۸ء میں ان کا خط پڑھ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ فروری کے پہلے ہفتے واپس چلا جاؤں گا۔ جنوری کا مہینہ پورا ہوا، تنخواہ جیب میں آئی تو رختِ سفر باندھا۔ دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ تار آیا۔ اپنے ساتھی حنیف سے کہا کہ تم ہی پڑھ کر سُنا دو۔ حنیف نے تار پڑھا اور سکتے کی کیفیت میں کھڑا ہو گیا۔ پوچھنے پر حنیف آفاق صدیقی کے گلے لگ کر رونے لگا اور آفاق صدیقی وہیں بے ہوش ہو گئے۔ صدیقی (۱۴) کہتے ہیں:-

> "مجھے جب ہوش آیا تو ہسپتال میں تھا۔ سارے سنگی ساتھی صبر و شکیب کی تلقین کر رہے تھے لیکن میری حالت غیر تھی جس کے نتیجے میں دو ہفتے ہسپتال رہنا پڑا۔"

آفاق صدیقی سے اُن کے والد بہت محبت کرتے تھے اور لکھتے ہیں کہ یہ میری بڑی بھول تھی کہ اُن کی رضامندی کے بغیر ادھر آ گیا تھا۔

۱۹۴۸ء میں سکھر کے تعلیمی ادارے تقسیم کے بعد سے بند پڑے تھے۔ ہندو اساتذہ اور ان کے کرتا دھرتا بھارت چلے گئے تھے۔ سیّد ارباب علی شاہ ضلع سکھر کے اے ڈی ایم مقرر ہوئے اور انھوں نے تجویز ظاہر کی کہ اگر

تعلیم یافتہ مہاجرین رضاکارانہ طور پر تعلیمی ادارے چلانا چاہیں تو گورنمنٹ اسکول کی عمارتیں اور فرنیچر ان کے حوالے کر سکتی ہے۔

"مسلم ایجوکیشن سوسائٹی" قائم ہوئی اور آفاق صدیقی نے بھی اپنی خدمات اس سوسائٹی کو پیش کردیں اور ماہانہ ۵۰ روپے مشاہرہ پر میراثِ پیغمبر اس کو قبول کرلیا۔

رشتۂ ازدواج:

آفاق صدیقی کی نسبت انڈیا میں طے پاچکی تھی اور ان کی ہونے والے سسرال کا اصرار تھا کہ یہ جلد از جلد وہاں چلے آئیں لیکن آفاق صدیقی نے تجویز پیش کی کہ وہ لوگ اِدھر آجائیں، لیکن ایسا نہ ہو سکا اور نسبت منسوخ ہوگئی۔ مسائل اور تنہائی نے کچھ بیزار سا کر دیا۔ آفاق صدیقی کے احباب نے اُن کی تشویش ناک صورتِ حال دیکھتے ہوئے ان کی بات ایک شریف گھرانے میں چھیڑ دی۔

بند روڈ سکھر کی پہاڑیوں پر ریلوے افسران کی کوٹھیاں تھیں جن میں سے ایک عبدالحکیم خان کی تھی۔ عبدالحکیم خاں، عبدالمجید خاں کے صاحبزادے تھے اور اُن کے دو مزید بھائی عبدالرّشید خاں اور عبدالسّلیم خاں بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔

ایک دن آفاق صدیقی کو بہانے سے مدعو کیا گیا اور باہمی گفت و شنید ہوئی۔ دوسرے دن ایک ساتھی نے آفاق صدیقی کو بتایا کہ عبدالحکیم نے اپنی چھوٹی بہن کے لیے آپ کا انتخاب کرلیا ہے۔ صدیقی (۱۵) کہتے ہیں:-

> "میں نے کہا" یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بے یار و مددگار اور غریب الوطن
> شخص کی خانہ آبادی اور وہ بھی ایسے حالات میں کہ میرے پاس تو سر چھپانے
> کو جھونپڑی بھی نہیں۔"

شادی خانہ آبادی کے لیے آفاق صدیقی نے ایک پُر خلوص دوست محمد حنیف خاں نے اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے آفاق صدیقی کو تسلی دی کہ مجھے اپنا بھائی سمجھو، میں جو کچھ کر سکتا ہوں کروں گا۔ تین چار مہینے تک بات چیت کا سلسلہ چلا اور بالآخر نکاح کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ رخصتی کے لیے انھوں نے مزید چند ماہ کی مہلت مانگی تا کہ شادی کے ضروری اخراجات کے لیے کچھ پس انداز کیا جاسکے۔ صبح آٹھ بجے سے ایک بجے تک اسکول میں تدریس کے بعد رات گئے تک ٹیوشن جاری رہتی۔ ایک رات ٹیوشن پڑھا کر واپس پلٹ رہے تھے کہ راستے میں عبدالمجید خان سے ملاقات ہوگئی۔ اُنھوں نے مصافحے کے بعد کہا کہ تمھارے ہاتھ تو بہت ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ گھر جا کر اُنھوں

نے آفاق صدیقی کی بے چارگی کا نقشہ کھینچا اور پھر بے سروسامانی کے عالم میں ۲۵ مارچ ۱۹۴۹ء کو ناظمہ بیگم کافی سارے جہیز کے ساتھ دُلھن بنی اور آفاق صدیقی کی زندگی میں داخل ہو گئیں۔ صدیقی (۱۶) کہتے ہیں:-

"مجھے اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ بہت ہی سلیقہ مند، صابر و شاکر، ذہین و فہیم اور بے حد پُر خلوص شریکِ حیات نصیب ہوئی، مگر اپنی تنگ دستی اور بے بضاعتی کے شدید احساس، کرب مہاجرتی کے اضطراب اور والدین کی دائمی جدائی کے صدموں نے تمام مسرتوں کو بے کیف سا بنا دیا۔"

حکیم شمس الحسن اختر سہارنپوری نے میرا سرپرست بن کر میری طرف سے دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا۔

آغاز شعر گوئی اور ادبی سرگرمیاں:

بہت بچپن میں ۱۹۳۵ء کے آس پاس مین پوری کے ایک مشاعرے میں آفاق صدیقی نے جگرؔ مراد آبادی کو سُنا اور بہت متاثر ہوئے۔ والد صاحب کو بھی جگرؔ بہت پسند تھے اور وہ کبھی کبھار آفاق صدیقی کے گھر بھی آیا کرتے تھے جہاں اگر وہ کیف و سُرور میں نہ ہوتے تو ترنم کے ساتھ بچے نقدی سے بھی فیض یاب ہوتے۔ ۱۹۳۹ء میں قصبہ کمال گنج کے سرکاری سکول میں آفاق صدیقی کا داخلہ ہو گیا۔ دوستوں کا قافلہ سکول سے واپسی پر کھیتوں اور باغوں کا لمبا چکر کاٹتا۔ تمام دوست ادبی ذوق شوق رکھتے تھے۔ راستے میں جہاں ستانے کے لیے بیٹھتے وہیں لطیفہ گوئی، بیت بازی اور گلوکاری کی محفل جم جاتی۔

آم کے موسم میں امان آباد اور شیخ پور مین خوب مشاعرے ہوتے۔ ہادی امان آبادی قادرالکلام شاعر تھے۔ شیخ پور سے مولوی عبدالرزاق، مولانا اشرف عالم، شیخ ظہور الحق اور ڈاکٹر سعید جیسے لوگ بھی ابھرتے ہوئے شعراء کی حوصلہ افزائی کرتے۔

فتح گڑھ اور فرخ آباد میں باقاعدہ مشاعرے ہوتے جنھوں نے آفاق صدیقی کی ذہنی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ شاعری کے ابتدائی دور میں تکڑم شیخو پوری کے طور پر انھوں نے اپنی غزل مشاعرے میں سُنائی جِس کا مقطع تھا(۱۷)

تعجب کیا جو تکڑم شیخ پوری ؎
غزل کہنے میں یکتا ہو رہا ہے

یہ غزل کہنا ان کو مہنگا پڑا۔ ایک بزرگ شاعر نے کہا کہ خرافات لکھنے کو شاعری نہیں کہتے میاں صاحب زادے! سنجیدہ شعر کہنے کی مشق کرو۔

فتح گڑھ اور فرخ آباد کے مشاعروں کے علاوہ کان پور جاتے تو حسرتؔ موہانی سے بھی ملتے۔ حسرتؔ موہانی سے آفاق صدیقی خاص قسم کی عقیدت رکھتے تھے۔ فتح گڑھ کے شعراء میں غلام تاباںؔ آفاق صدیقی کے لیے مشعلِ راہ بنے۔ صدیقی (۱۸) رقم طراز ہیں:-

"ان کی نظمیں سُن کر اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں مجھے بھی نظمیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا، لیکن زیادہ تر احسان دانش کی نظموں کے اثرات حاوی رہے۔ میرے ادبی ذوق و شوق کو تقویت دیتے ہوئے اردو اور فارسی کے استاد محترم مولوی بنے خاں سرخوش شادانی نے مجھے اسکول کی بزمِ ادب کا سیکرٹری بنا دیا۔"

گورکھ پور میں آفاق صدیقی نے نویں جماعت میں طرحی مشاعرے میں غزل پڑھی جِس کا مصرع طرح تھا

ع گِری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس پر انھیں اوّل انعام سے نوازا گیا۔ ۱۹۴۵ء میں ریاست رام پور کے یوپی اولمپکس کے ایک بڑے جلسے میں آفاق صدیقی نے اپنے مشاہدات و تاثرات پر نظم پڑھی جو پسند کی گئی اور اس وقت کے مشہور اخبارات میں شائع ہوئی۔ اس نظم کی اشاعت سے آفاق صدیقی باقاعدگی سے جرائد کو اپنی تخلیقات شائع کرنے کے لیے بھیجنے لگے۔

عالمی جنگ کے خاتمے پر برطانوی راج نے فتح کے جشن منانے کے لیے بڑے اور معروف شہروں میں رنگا رنگ تقاریب کا اہتمام کرنے کا حکم دیا تھا۔ فرخ آباد میں بھی آل انڈیا طرحی مشاعرہ ہوا جس کی تمام غزلیں ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے براہِ راست نشر ہوئیں۔ اس میں طرح مصرع طرح تھا:-

ے ہم تھے کہ اڑ گئے صفِ محشر لیے ہوئے

مشاعرے کا آغاز آفاقؔ صدیقی کی غزل سے ہوا۔ آفاق صدیقی کہتے ہیں کہ اس دَور میں ترقی پسند تحریک تیزی سے مقبول ہو رہی تھی اور نوجوان لکھنے والے روایتی اندازِ نگارش چھوڑ کر ترقی پسند رجحانات و میلانات قبول کر رہے تھے۔

حصولِ آزادی کے لیے جلسوں اور تقاریب میں آفاق صدیقی جوش و خروش سے اپنی نظمیں پڑھتے اور داد وصول کرتے رہے۔ تقسیم ہوئی، فسادات ہوئے اور ہجرت کا کرب ناک مرحلہ انجام پذیر ہوا۔ آفاق صدیقی انڈیا

سے پاکستان آنے کا دلچسپ واقعہ سُناتے ہوئے کہتے ہیں کہ (۱۹) بحری جہاز سے میں تنہا سوٹ کیس تھامے سب سے الگ تھلگ کسی گوشہ عافیت کی جانب قدم بڑھا رہا تھا کہ ایک جانب سے من موہنی سی آواز سُنائی دی۔ میں ادھر چل پڑا۔ دیکھا کہ راگ رنگ کی چھوٹی سی محفل جمی ہے۔ بہت ہی مسحور کن دھن تھی لیکن میری سمجھ میں وہ بول نہ آئے ۔میں نے اپنے ساتھ کھڑے ایک شخص سے کہا کہ یہ گیت تو مجھے اچھا لگ رہا ہے لیکن اُس کی زبان مجھے سمجھ نہیں آرہی۔ وہ شخص خوش دلی سے بولا کہ یہ شاہ لطیف کا کلام ہے تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یہ آفاق صدیقی کا سندھی زبان میں پہلا تعارف تھا۔ زندگی میں شادی کے بعد کچھ سکون میسّر آیا تو سکھر کی نمائندہ ادبی تنظیم "انجمن فروغِ ادب" جِس کے سیکرٹری جنرل خمار انصاری تھے اس کی تقاریب میں شرکت کرنے لگے۔

۱۹۴۹ء کے وسط میں خمار انصاری کراچی چلے گئے تو انجمن کے معتمدِ عمومی کی ذمہ داریاں آفاق صدیقی کے حصے میں آگئیں۔ اُنھوں نے باقی احباب کے ساتھ مل کر ادبی سرگرمیوں کے دائرہ کو بڑھایا جس سے سندھی زبان کے اہلِ قلم کا تعاون بھی اُنھیں حاصل ہوگیا۔ جمیعت الشعرائے سندھ ان کے ساتھ مل کر کام کرنے لگی۔

"انجمن فروغِ ادب" کا کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا تو سندھی شعراء بھی اپنے اردو کلام سے نوازتے۔ اس کے علاوہ سندھی اور اردو کے مشترکہ مشاعرے بھی منعقد کیے جاتے۔

اپریل ۱۹۵۰ء میں اردو سندھی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق، میر حسّام الدّین راشدی، استاد قمر جلد سوی، نسیم امروہی، رفیع عالم، سیّد اظہر گیلانی، مولانا ماہر القادری، ادیب سہارن پوری اور اندرون سندھ سے کئی شعراء اور ادباء نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں جمیل الدین عالی کے دوہوں نے بھی بڑا اچھا تاثر پیدا کیا۔

مہر الٰہی شمسی جو آفاق صدیقی کے دوست تھے اُنھوں نے " ہفت روز کلیم "کا اجراء کیا اور آفاق صدیقی اعزازی مدیر بن گئے۔

اس دوران آفاق صدیقی، اختر لطیف، سلیم قیصر اور ن م نیازی نے "ماہنامہ کوہ کن" نکالا لیکن دو ہی شماروں کے بعد بعض وجوہات کی بناء پر اسے بند کر دیا گیا۔

آقائے غفوری کا کیفے ایران، کوئنس روڈ پر صرف ایک چائے خانہ نہیں بلکہ مشاعروں، اشاعتی کاموں اور بڑی بڑی ادبی کانفرنسوں کے منصوبے یہیں بنائے جاتے تھے اور اُن پر کتنا عمل درآمد ہوا، یہ جائزہ بھی یہیں لیا جاتا تھا۔

۱۹۴۸ء سے سندھی زبان اور سندھی زبان سے متعلق آفاق صدیقی کے مضامین مختلف پرچوں میں شائع ہورہے تھے۔ صدیقی (۲۰) کہتے ہیں:-

> "اس بات کو اب سبھی دوست تسلیم کرتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد سندھی سے اردو تراجم کا سب سے زیادہ کام راقم الحروف نے کیا ہے۔"

۱۹۵۳ء میں دوستوں کے مشورے اور حوصلہ افزائی سے ۲۳ دسمبر ۱۹۵۳ء کو وزیرِ قانون اے، کے بروہی نے دو روزہ کانفرنس کا افتتاح کیا۔ مشاعرے کی صدارت شوکت تھانوی نے کی۔ اس کانفرنس کے بعد سندھ میں کئی نئی انجمن وجود میں آئیں جیسا کہ دبستانِ سندھ، سندھ ادبی سرکل اور لطیف اکادمی وغیرہ۔

افکار ساقی، ادب لطیف اور انڈیا کے کئی جرائد میں آفاق صدیقی کے مضامین اور تراجم شائع ہوتے رہے۔

اولاد:

آفاق صدیقی کی پہلی اولاد اُن کی بیٹی ناہید انجم تھی جِسے سب گڑیا کہتے تھے۔ لیکن وہ کم سِنی میں ہی وفات پا گئیں۔ اُن کی بیوی ناظمہ بیگم پر اس واقعے کا گہرا اثر ہوا اور وہ مزید عبادت گزار بن گئیں۔ ۱۴ اگست ۱۹۵۵ء کو اُن کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جِس کا نام شاہد آفاق صدیقی رکھا گیا۔

مشاعرے:

جہاں کہیں سے مشاعرے کا دعوت نامہ آتا، آفاق صدیقی ضرور جاتے۔ بڑے شہروں میں مشاعروں میں شریک ہوئے اور داد و تحسین سے نوازے گئے۔ انھوں نے بھارت یاترا کے دوران بھی کئی مشاعروں میں حصہ لیا۔

حیدر آباد سٹیشن قائم ہوا تو افتتاحی تقاریب کے سلسلے میں مشاعرے کا بھی اہتمام کیا تھا۔ آفاق صدیقی کو بھی مدعو کیا گیا۔ اس مشاعرے میں جگر مراد آبادی، شان الحق حقی، ماہر القادری، بہزاد لکھنوی، ادیب سہارن پوری اور دوسرے کئی شعراء نے شرکت کی۔

سکھر میں "انجمن فروغِ ادب" کے مشاعروں کی روایت کی بدولت آس پاس کے شہروں میں مشاعروں کا رواج پڑنے لگا۔ کراچی ریڈیو اسٹیشن قائم ہونے سے شعر و ادب کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں دوسرے شہروں سے شعر و ادب کے حوالے سے کراچی کا سلسلہ جُڑا اور مشاعرے اور محافل بڑے پیمانے پر برپا ہونے لگے۔ ڈپٹی کمشنر

آفتاب احمد کے دور میں سکھر کا یادگار مشاعرہ ہوا جس میں انڈیا اور پاکستان کے مشہور شاعروں نے شرکت کی۔ ۱۹۵۶ء میں کل پاکستان ثقافتی کانفرنس کا انعقاد بھی کیا گیا۔

ذریعہ روزگار اور ملازمت:

آفاق صدیقی گوشہ تدریس سے وابستہ تھے۔ ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیاں اور ٹیوشن وغیرہ بھی جاری رہی۔ ہفت روزہ کلیم سے بھی وابستہ تھے۔ جزوقتی اُنھوں نے سندھی سے اردو میں تراجم کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا۔ سکھر جیسے بڑے شہر میں کوئی کالج نہ تھا۔ نصرت حسن ڈپٹی کمشنر نے عوامی فلاح و بہبود کے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے جِن کے ساتھ مشاورت اور کوشش میں آفاق صدیقی بھی شامل تھے۔ صدیقی (۲۱) کہتے ہیں:-

> "راقم الحروف نے جو خدمات انجام دیں وہ بیان کرنے لگوں تو خود ستائی ہو گی اس لیے یہی کہ دینا کافی ہے کہ سائنس، آرٹس اور کامرس کے شعبوں پر مشتمل یہ بالائی سندھ کا سب سے بڑا کالج ہے جِس کی بنیادوں میں اپنا خونِ جگر بھی شامل ہے۔"

۱۹۵۸ء میں دوست اختر لطیف کے مشورے سے سینٹ میریز ہائی اسکول کی ملازمت کر لی جِس کے سربراہ ہالینڈ کے فادر انو سینٹ تھے۔

۱۹۷۴ء میں سندھ ایجوکیشنل کونسل نے کالج کے لیے آفاق صدیقی کو منتخب کر لیا۔ انگریزی ادب کے پروفیسر اکرم انصاری کی مدد سے اُن کے پوسٹنگ آرڈر ہو گئے۔ میرپور میں وہ شام کو کالج میں پڑھاتے اور دن میں علم و ادب کے کام نمٹاتے۔ میرپور میں رہتے ہوئے بھی سکھر سے ناتہ نہ ٹوٹا اور قلبی تعلق قائم رہا۔

۱۹۷۴ء سے اپریل ۱۹۸۲ء تک آفاق صدیقی گورنمنٹ ماڈل کالج میرپور سے وابستہ رہے۔ اس عرصے مس کالج کا مجلّہ "مخزنِ تھر" کے نام سے اُنھوں نے ترتیب دیا اور اعلیٰ درجے پر علمی و ادبی تقاریب کا انعقاد کرتے رہے۔ سیّد غوث علی شاہ جب سندھ کے وزیر تعلیم تھے تو انھوں نے آفاق صدیقی کی حوصلہ افزائی فرمائی اور کراچی کے ٹرانسفر آرڈر نکلوا دیے۔ لیاقت گورنمنٹ کالج میں سیکنڈ شفٹ میں تدریسی ذمہ داریاں اُن کی خواہش پر اُنھیں تفویض کر دی گئیں۔ وہاں ۱۹۸۸ء تک سلسلۂ روزگار رہا۔ ۱۹۸۸ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ٹیوٹر بنے جو سلسلہ تاحال "صبح کرنا شام کا" تک جاری تھا۔

پریمئیر کالج میں دو سال کے بعد پروگریسوڈگری کالج میں ذمہ داریاں ادا کرنے لگے اور آپ بیتی کی تخلیق تک اُن کی ملازمت وہیں جاری تھی۔

ادبی سرگرمیاں:

بہت سی ذمہ داریاں آفاق صدیقی پہلے ہی نبھارہے تھے کہ ۱۹۵۹ء میں "پاکستان رائٹرز گلڈ" کا قیام عمل میں آیا۔ بالائی سندھ کے سب ریجن کے لیے آفاق صدیقی کو کنوینر نامزد کیا گیا اور بعد میں سیکرٹری بنا دیا گیا۔ اس کے تحت قومی سطح کے رائٹرز کنونشن ہوئے اور دس بارہ کُتب بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔

کراچی دارالسلطنت تھا اور گلڈ کا مرکزی دفتر بھی کراچی میں تھا۔ رائٹرز گلڈز کے زیرِ اہتمام محافل ہوتیں اور اکثر جمیل الدین عالی آفاق صدیقی کی دعوت پر ممتاز اہلِ قلم کا قافلہ کراچی سے سکھر لے آتے۔ اِن ادبی اجتماعات کی زینت بڑے بڑے ادباء بنے۔

اسلامیہ کالج سکھر ادبی تقاریب کا مرکز تھا۔ ۱۹۵۷ء میں کالج کا ضخیم مجلّہ بھی شائع کیا۔ ۱۹۶۱ء میں کچھ ناگزیر وجوہات کی بِنا پر سکھر کالج کو خیر آباد کہنا پڑا۔

۱۶ اگست کو بابائے اردو کے وفات پانے پر سکھر میں ایک بڑا تعزیتی جلسہ کیا گیا جِس میں کل پاکستان ادبی اجتماع اور بہت بڑا مشاعرہ ہوا جِس کی صدارت مصطفیٰ زیدی نے کی۔ صدیقی (۲۲) کہتے ہیں:-

> "مصطفیٰ زیدی بڑے شاعر ہی نہیں بہت ہی درد مند اور سچے ادب دوست انسان تھے۔"

مصطفیٰ زیدی جب ضلع خیر پور کے ڈی سی ہوئے تو "جشن جوش" کا اہتمام کیا گیا۔ اس سلسلے میں کل پاکستان مشاعرہ ہوا۔ صدارت جوش ملیح آبادی کی اور نظامت مصطفیٰ زیدی کی تھی۔ مشاعرے میں میری باری پر مصطفیٰ زیدی نے فرمائش کرکے نواب شاہ مشاعرے میں پڑھی جانے والی غزل سُنی۔ جب مصطفیٰ زیدی لاہور ڈویژن کے کمشنر تھے اور ساہیوال کا سوسالہ جشن منایا گیا تو سکھر سے مجھے اور خیر پور سے منظر ایوبی کو کُل پاکستان مشاعرے کے لیے بُلایا گیا۔

ایوب خاں کے دور میں بھی ثقافتی سرگرمیاں عروج پر رہیں۔ سکھر میں ہر سال بڑے پیمانے پر "جشنِ مہران" منایا جاتا۔

بہاول پور میں "جشنِ روہی" کا مشاعرہ بھی یادگار تھا۔ یہیں رحیم یار خاں کے مشاعرے کا دعوت نامہ مِلا۔ منظر ایوبی گورنمنٹ کالج خیر پور میں اردو کے استاد تھے۔ عنایت مرزا اور اسلم باجوہ جیسے ادب نواز، ادب پرور کمشنروں کی سرپرستی میں جشنِ خیر پور کی ادبی و ثقافتی تقاریب کے انتظام میں منظر ایوبی کا نمایاں حصہ تھا۔

انڈیا کی ایک ادبی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو اسی بہانے اپنے آبائی شہر فرخ آباد بھی گئے اور بیتی باتیں تازہ کیں۔

سترہ برسوں کے بعد سب سے ملے اور دو ہفتے تک مختلف تقاریب اور مشاعروں میں شرکت کی۔ سینٹ میریز ہائی اسکول میں غیر نصابی سرگرمیوں کا شعبہ آفاق صدیقی کے ذمے تھا اس کے علاوہ سالانہ تقریب میں مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں باقی شعراء کی طرح آفاق صدیقی نے بھی ملی نغمے لکھے اور فوجی جوانوں کی نذر کیے۔

ملتان سے اُن کو خصوصی اُنسیت تھی۔ جشنِ فرید کے سلسلے میں وہ کئی ادبی تقاریب میں شریک ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کا کئی روزہ سیمنار تھا۔ اس میں آفاق صدیقی کا مقالہ اردو اور علاقائی زبانوں کے تعلق پر تھا۔ سب نے اسے بہت پسند کیا۔

سکھر کی علمی و ادبی شخصیت احمد مقصود حمیدی کے مشورے سے آفاق صدیقی نے شاہ لطیف کی شخصیت اور شاعری پر تحقیقی کتاب لکھنے کا مشورہ دیا جسے انھوں نے "عکسِ لطیف" کے نام سے پانچ سال میں مکمل کیا۔ ۱۹۷۴ء میں اس کی طباعت ہوئی۔ "مجلس ادب" سکھر کی ایک قابلِ ذکر ادبی تنظیم تھی جس کے بانی حمید عظیم آبادی تھے۔ حمید عظیم آبادی نے آفاق صدیقی کو سب ریجنل سیکرٹری کی حیثیت سے انتظامی کمیٹی میں شامل کیا اور "جام جم" کے نام ادبی جریدہ جاری کیا۔ اس کے علاوہ شاد عظیم آبادی کی کلیات بھی شائع ہوئی۔ لیکن بعد میں اسی کا شیرازہ بکھر گیا۔ میر پور خاص کے روٹری کلب کو مہمانِ خصوصی بنایا جاتا۔ "ایوانِ ادب" ادبی تنظیم بنائی اور سب دوستوں نے ساتھ دیا۔ حبیب رومی اس کے ناظم تھے۔

سب سے پہلے علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب خطبات مدارس کی تلخیص اور تبصرے پر مشتمل کتاب ترتیب دی جس کا پیش لفظ آفاق صدیقی نے لکھا۔ "ایوانِ ادب" کا ایک قابلِ قدر کارنامہ کل سندھ سیرت کانفرنس کا انعقاد تھا۔ بڑے پیمانے پر نعتیہ مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔

اس کے بعد وہ کراچی آگئے۔ کراچی میں لیاقت گورنمنٹ کالج، پریمئیر کالج اور پروگریسو کالج میں تدریسی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں کے انچارج رہے۔ اپنی تخلیقات، ادبی سرگرمیوں کے ساتھ اپنی ملازمت بھی

جاری رکھی اور تاحیات مسلسل ادب پروری میں لگے رہے۔ انھوں نے ۴۰ سے زیادہ کتب کو تصنیف اور تالیف کیا۔ مرتب، تقریبات پذیرائی، رونمائی، ادباء کے ساتھ شام منانے کا کام اس کے علاوہ ہے۔ وہ جہاں جہاں رہے ادبی مجلّوں کی ترتیب، تزئین کا کام اُنھی کے ذمے ہوتا تھا۔ اپنے اس ذوق کو اپنی محنت اور لگن سے اُنھوں نے چار چاند لگائے اور پیچھے نقشِ قدم چھوڑے۔

عقدِ ثانی:

آفاق صدیقی کی پہلی شریکِ حیات کا نام ناظمہ تھا جن کے بطن سے شاہد صدیقی اور ایک بیٹی ناہید انجم پیدا ہوئے۔ ناہید انجم کم سِنی میں ہی وفات پا گئی۔ ناظمہ اپنے بیٹے شاہد صدیقی کے ساتھ حج کر کے آئیں تو بجھی بجھی سی رہنے لگیں۔ بقول آفاق صدیقی مغرب اور عشا کی نمازوں کے بعد اُن کی بھیگی بھیگی سُرخ آنکھیں ظاہر کرتیں کہ وہ کسی کرب میں مبتلا ہیں۔

۵ اگست ۱۹۹۲ء کی رات ایک انوکھی بات ہوئی۔ ہوا یوں کہ صدیقی (۲۳) اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

> "ناظمہ نے تہجّد کی نماز پڑھنے کے بعد مجھ سے پوچھا "کیوں جی! اکیلے رہ سکتے ہو؟ "ہاں رہ سکتا ہوں مگر تمھارے بغیر نہیں۔" اور اگر میں مر جاؤں تو"میں اس وقت علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ایک امتحانی کام میں مصروف تھا۔ آدھی رات بیت چکی تھی اس لیے ناظمہ کی یہ بات بڑی ناگوار گزری اور میں نے کہا "مرنا تو سب کو ہے لیکن تمھیں اس وقت یہ خیال کیوں آیا؟ میرے سوالوں کا کوئی جواب نہ مِلا۔ بس یہ ہوا کہ اُس نے بڑی بے ساختگی اور والہانہ انداز میں اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور تین چار مرتبہ میری پیشانی کو چُوما۔ میں نے بڑے پیار سے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور گلوگیر آواز میں کہا تم بہت تھکی تھکی سی لگ رہی ہو اب سو جاؤ"

آفاق صدیقی کہتے ہیں کہ ایک دو گھنٹے کام کر کے میں سو گیا کہ عجیب و غریب خراٹوں سے میری آنکھ کُھل گئی۔ گھڑی دیکھی تو چھے بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ ناظمہ چت لیٹی ہوئی تھی۔ اُن کے ہاتھ سینے پر تھے میں نے کروٹ دلانے کے لیے ہاتھ بڑھائے اور کہا کہ تم تو سوتے میں بھی خراٹے نہیں لیتیں۔ آج کیا ہوا؟ چلو اٹھ جاؤ۔ کئی آوازیں دینے کے باوجود کوئی جواب نہ مِلا تو میں گھبرا کر شاہد کے کمرے کی طرف دوڑا اور کہا کہ جلدی آؤ، تمھاری امی کو کیا ہو گیا ہے۔ شاہد اور کشور (بہو) ناظمہ کو ضیاء الدین ہسپتال لے گئے لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ ناظمہ کی وفات کے

بعد آفاق صدیقی تنہا رہ گئے۔ ناظمہ اُن کے دُکھ سُکھ کی ساتھی تھیں۔ وہ بُری طرح تنہائی کا شکار ہو گئے۔ بیٹا پہلے ہی افسردہ تھا باپ کی حالت دیکھ کر ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ یہ صورتِ حال بڑی صبر آزما تھی۔

صدیقی (۲۴) کہتے ہیں:-

> "خانگی حالات کسی حد تک بہتر ہوئے۔ پیارے اکلوتے بیٹے کو دوبارہ زندگی مِلی تو میں نے سوچا کہ اگر اپنے آپ کو باقی ماندہ زندگی کے لیے ثابت قدم رکھنا ہے تو لکھنے پڑھنے کا کوئی ایسا کام ہونا چاہیے جو میرے دُکھوں کو بہلاوہ دے سکے۔"

یوں اُنھوں نے عرب امارات کے ریڈیو نیٹ ورک کے لیے تہذیب انسانی کے سفر پر فیچر لکھنا شروع کر دیے جس سے دھیان کافی بٹ گیا۔

روزانہ سائیکل پر ناظمہ کی قبر پر جاتے اور مزید افسردہ ہوتے۔ آخر کار تیزی سے گرتی ہوئی صحت اور بے قرار دل کو سہارا دینے کے لیے عَقدِ ثانی کا فیصلہ کیا اور بیٹے کو آگاہ کیا تو اُس نے بھی تائید کی۔ کئی ماہ کی تلاش کے بعد ڈاکٹر عشرت علی ہاشمی کی بہن قیصر جہاں ہاشمی کا انتخاب کیا گیا اور ۱۹۹۳ء میں ڈاکٹر (ہومیو پیتھک) اور معلم قیصر جہاں اُن کی زندگی میں آ گئیں۔ صدیقی (۲۵) رقم طراز ہیں:-

> "اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہماری خانگی زندگی بہت پُر سکون اور پُر اطمینان ہے میں دل جمعی سے لکھنے پڑھنے کے مشاغل میں منہمک رہتا ہوں اور یہ نئی جیون ساتھی اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ میری ناز برداری میں کوئی کمی نہیں آنے دیتیں۔"

شخصی خصائل:

آفاق صدیقی کا تعلق فرخ آباد، انڈیا سے تھا ہجرت کر کے وہ پاکستان آئے وہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور ہندوستان کے تہذیب یافتہ تھے۔ ان کو تحقیق، تدریس، افسانہ نگاری، شاعری اور تنقید سے دل چسپی تھی۔ ان کی شاعری ترقی پسند مکاتبِ فکر سے متاثر ہونے کے باوجود کلاسیکی روایات اور اپنی تہذیبی و ثقافتی روّیوں کی امین تھی۔ انھوں نے اندھی تقلید سے گریز کیا اور ہمیشہ اپنے لیے نئی راہ متعین کی۔ وہ کہتے تھے کہ اکابرین کو تنگ نظری اور کوتاہ بینی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا ایک "گلوبل ویلج" کی شکل اختیار کر گئی ہے اس لیے رجحانات چاہے مشرقی ہوں یا مغربی ان کی پیروی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ رجحانات و میلانات ہماری تہذیبی و

ثقافتی روایات سے متصادم نہ ہوں۔ مغرب سے ہمیں ہنر مندانہ عناصر اپنانے میں فراغ دل ہونا چاہیے تاکہ ترقی کر سکیں۔ وہ اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ مہذب دنیان میں اردو زبان، اس کے ماہرین ،اس کے تجزیوں کو تمام ترقی یافتہ عالمی رُتبے کی حامل زبانوں میں اوّلیت حاصل ہو گی۔

وہ خود مشاعرے پڑھتے تھے، سُنتے تھے اور منعقد کرتے تھے اس حوالے سے اُن کا خیال تھا کہ مشاعرے تخلیقِ ادب میں معاون ہیں۔ انھوں نے شاعروں کے ادبی ذوق و شوق کو بڑھایا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر ادبی نشستوں اور تقاریب کی بھی اپنی افادیت ہے۔ آفاق صدیقی کو بنیادی طور پر غزل گوئی پسند تھی کیونکہ غزل ایک ایسی صنف ہے جِس میں ایک ہی شعر میں خوش اسلوبی سے اپنی حکایت دِل سموئی جاسکتی ہے لیکن اس کے لیے خوش سلیقگی کی ضرورت ہے۔ آفاق صدیقی کی مادری زبان اگرچہ اُردو تھی انھیں فارسی اور سندھی پر عبور تھا۔ انھوں نے سندھی تراجم پر خصوصی کام کیا۔ اُن کی چالیس میں سے اٹھارہ تصانیف سندھی سے متعلق ہیں ان کے تحقیقی کام کو اردو اور سندھی ادب کے حوالے سے اہم اور سندی خیال کیا جاتا ہے۔

ایوارڈز:

- حکومتِ پاکستان کی طرف سے آفاق صدیقی کی ادب کے حوالے سے خدمات کے اعتراف میں انھیں "تمغہ حسنِ کارکردگی" سے نوازا گیا۔
- لطیف ایکسی لینس ایوارڈ۔
- اس کے علاوہ پچاس سالہ شعری سفر کا جشن منایا گیا۔ ان کے حوالے سے کتاب مرتب کی گئی اور سینکڑوں شیلڈز، ایوارڈز اور میڈلز دیے گئے۔

وفات:

جسم خاک ہو جاتا ہے لیکن افکار زندہ رہتے ہیں۔ آفاق صدیقی نے اپنے ادبی سفر کو آخری ایام تک جاری رکھا۔ آفاق صدیقی اُس چراغ کی مانند تھے جو بجھتے ہوئے اپنے جیسے کئی چراغ روشن کر کے جاتے ہیں۔ اُن کے سینکڑوں شاگرد اپنے استاد کے منتقل کردہ علم کی صورت اس دنیا میں اجالا کر رہے ہیں۔ اُن کی خدمات نصف صدی پر زیادہ سے محیط ہیں۔ پہلے اُن کی شریکِ حیات ناظمہ تبسم اور پھر قیصر آفاق ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔ بڑھاپے میں شریکِ سفر کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ اُن کے دونوں شریکِ سفر اچھے، محبت کرنے والے تھے لیکن دونوں کی زندگی نے وفا نہ کی۔ قریبی شاگردوں نے خبر گیری کا گو سلسلہ جاری رکھا لیکن وہ دن بدن کمزور ہوتے چلے گئے اور بلآخر ۸۴ سال کی عمر میں ۱۷ جون ۲۰۱۲ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔ وہ کراچی کے سخی حسین قبرستان میں مدفون ہیں۔

فصل دوم

"صبح کرنا شام کا" کا موضوعاتی جائزہ

معرفتِ ذات صرف اولیاء اور صوفیاء ہی کا مرکزِ نگاہ نہیں رہی۔ عام انسان بھی اپنے بارے میں سوچتا ہے اور سوالوں کے جواب چاہتا ہے۔ انسان زندگی خواہ اجتماعی ہو یا انفرادی گوناگوں تجربات کا مرقّع ہے گویا ہر سانس ایک تجربہ ہے۔ آپ بیتی نگار کے لیے چند شرائط ضروری ہیں۔ اوّل تو یہ کہ فن پر اُس کی گرفت ہو۔ دوم وہ زمانے کے بدلتے ہوئے مذاق کے مطابق شخصیت کے اِن عناصر پر زور دے جو پڑھنے والے کی نظر میں اہمیت رکھتے ہوں اور تیسرے نمبر پر اس کی تحریر کے ذریعے فن ترقی کر سکے۔

مذاقِ زمانہ وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ ضروری نہیں کہ پچھلے وقتوں میں جو عناصر مقبول تھے موجودہ عہد کے لوگ بھی اِنھیں پسند کرتے ہوں۔ شخصیت نگاری ایک فن ہی نہیں ایک سائنس بھی ہے۔ مختلف زمانوں اور مختلف جگہوں پر سوچنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ ٹیکنالوجی، سیر و سفر کی آسانیاں، ورقی اور برقی ذرائع اور ایسے ہی بہت سی دوسرے وجوہ ہمارے معاشرتی نقطہ نظر کو تبدیل کرنے کے لیے کافی ہیں چنانچہ کامیاب آپ بیتی نگار وہ ہے جو وقت کے تقاضوں کو پوری طرح سمجھتا ہے اور پھر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے شخصیت کے کن پہلوؤں کو نمایاں تر کرنے کی ضرورت ہے۔ انصاری (۲۶) کہتے ہیں:-

> "ہمارے تمام فنونِ لطیفہ، فن کار کے اظہارِ ذات کے سوا کچھ نہیں۔ خواہ وہ تاج محل جیسی سُبک اور حسین عمارت ہو یا میر و غالب کی اثر آفریں شاعری۔ یہ انسانی خاصا ہے کہ وہ اپنی ذات کا کوئی نقش دنیا میں چھوڑ کر جانا چاہتا ہے۔ اس طرح فانی زندگی بقائے دوام حاصل کرتی ہے۔"

ہمارا دَور نقد کا دَور ہے۔ اچھا سوانح نگار وہی ہے جو اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرے۔ ہر بڑے آدمی کے اندر ایک چھوٹا آدمی بھی ہوتا ہے۔ سوانح نگاری شاید اُسی اصل آدمی کی تلاش و جستجو کا نام ہے۔ بقول یوسف جمال انصاری آپ بیتی پر ایمان لانا قارئین کے لیے ضروری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشاہیر ادب کی آپ بیتیوں پر بعد میں لوگوں نے اخلاقی رائے دی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو عام قاری کبھی بھی خود نوشت پڑھ کر ٹھیک نتیجے پر کبھی بھی نہ پہنچ سکے گا۔

سوانحی ادب کے بنیادی تین عناصر تاریخ، فرد اور کہانی میں سے کوئی پہلو بھی کمزور ہو گا تو سوانح حیات تشنہ رہے گی اور فنی تقاضوں پر پورا نہیں اترے گی۔ "صبح کرنا شام کا" آفاق صدیقی کی خود نوشت ہے۔ ۱۶۰ صفحات کی یہ خود نوشت ۳۲ عنوانات میں منقسم ہے۔ یہ ۲۰۰۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کا عنوان غالب کی غزل کا ایک مصرعہ ہے۔ پورا شعر کچھ اس طرح ہے۔(۲۷)

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جُوئے شیر کا

اس کتاب میں "عرضِ ناشر" تو ہے لیکن کوئی تقریظ پیش لفظ یا دیباچہ نہیں ہے۔ اس کا انتساب "بھائی محمود احمد خاں" کے نام سے ہے۔ خود نوشت دراصل انکشافِ ذات ہی نام ہے لیکن "صبح کرنا شام کا" کا مطالعہ قاری پر آفاق صدیقی کی شخصیت کی ہر پَرت کھول دیتا ہے۔ آفاق صدیقی نے اپنے ساتھ گزرنے والے حادثات و واقعات میں قاری کو بھی شریک کر لیا ہے۔ ان واقعات کی صداقت اور شخصیت پر ان کے اثرات ان کی تحریر کو مخصوص مزاج عطا کرتے ہیں۔ ان کی خود نوشت کے مطالعے سے ان کے باطن تک رسائی ہو جاتی ہے۔ آفاق صدیقی اپنی فکری بصیرت سے کام لے کر عام اشیاء واقعات اور روز مرہ عادات و معمولات کے انوکھے پہلو پڑھنے والے کے سامنے لا کر اُسے اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں یوں قاری ان کے تجربے اور مشاہدے میں شامل ہو جاتا ہے۔ آفاق صدیقی کی خود نوشت اُن کی زِندگی اور تجربات کا نچوڑ ہے۔ جذبے اور احساسات سے مزّین اسلوب میں آفاق صدیقی کی شخصیت اور زبان کا حسن گھل مِل گیا ہے۔ وہ اپنی آپ بیتی میں لاشعوری طور پر اپنی ذات کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ زندگی نے ان کو جو سبق دیا ہے ان کی نظر اس کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ پورے خلوص کے ساتھ اپنا خیال قاری تک منتقل کر دیتے ہیں۔

زندگی کے تلخ حقائق انسان کی بہت سی خواہشات کو پایہ تکمیل تک پہنچنے نہیں دیتے لیکن قلم ایک ایسی چیز ہے جِسے آپ استعمال کر کے تخیّل میں ہر خواہش کو پورا کر سکتے ہیں۔ ان کی ذات سے مرتعش ہونے والی سچائیاں اور ان سچائیوں کا داخلی رخ ان کی خود نوشت میں جا بجا نظر آتا ہے۔ خود نوشت میں ان کی ذات کے مخفی گوشے نہایت سادگی سے قاری کے سامنے آ جاتے ہیں۔ ذات کے ابلاغ کی یہ جل ترنگ قاری کو احساسات و جذبات کی قوس قزح سے آشنا کرتی ہے۔ مصنف نے اپنی پیدائش، والدہ کی بے توجہی، والد کی محبت کو جب جب بیان کیا ہے قاری گہرے دُکھ میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنی دونوں بیوؤں کی تعریف کرتے ہیں یا اپنے بیٹے کی پرورش کرنے کا ذکر کرتے ہیں تو ایسے الوہی جذبات نظر آتے ہیں۔

آفاق احمد صدیقی کی آپ بیتی میں ہم ان کے حالات زندگی، خاندانی پس منظر، ادبی سفر اور دیگر سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فریدی (۲۸) اس سلسلے میں اپنی رائے دیتے ہیں:۔

"فرد معاشرے میں اپنی شناخت چاہتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے جذبات و احساسات کو سمجھیں۔ اس کے کردار کے اچھے پہلوؤں کی تحسین کریں۔ اس کی کاوشوں اور کامرانیوں اور ناکامیوں پر اظہارِ افسوس کریں۔ عموماً اس خواہش کی تسکین احباب، اعزہ اور متعلقین سے مل کر ہو جاتی ہے لیکن بعض طبائع اس پر قانع نہیں ہوتیں وہ اجنبی افراد تک اپنی ذات کو پہنچانا چاہتی ہیں اور اس کے مختلف وسیلے ڈھونڈتی ہیں۔ ان میں سے ایک وسیلہ خود نوشت ہے۔"

آفاق صدیقی کی خود نوشت "صبح کرنا شام کا" اپنے عہد کا عصری منظر نامہ ہے۔ کوئی بھی معاشرہ سیاست کے عمل دخل کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ارسطو (۲۹) کے نزدیک:۔

"سیاست ایک علم بھی ہے اور فن بھی"

انسان بنیادی طور پر معاشرتی حیوان ہے۔ وہ اپنی ضروریات کے لیے دوسروں پر انحصار کرتا ہے۔ سیاست ایک ایسی چیز ہے جِس کے ذریعے ایک انسان دوسرے انسان کے معاملات میں دل چسپی لیتا ہے۔ سیاست ایک ایسا عمل ہے جِس میں دوسرے انسانوں کے معاملات میں جہاں دخل اندازی فرد کی مدد کے لیے کی جاتی ہے وہیں فرد اپنے معاملات کے تحفظ کے لیے خود بھی جدوجہد کرتا ہے۔ ادیب اپنے سیاسی فہم کو قاری پر ظاہر کرنے کے لیے اپنی تصنیف میں عوام اور حکومت کے درمیان تعلقات پر بحث کرتا ہے۔ ایک ادیب کا سیاسی شعور قاری پر یہ واضح کرتا ہے کہ معاشرے میں فرد کے حقوق کس حد تک پورے ہو رہے ہیں اور انسانی استحصال کہاں کہاں ہو رہا ہے۔

اگر سیاسی نقطہ نظر سے "صبح کرنا شام کا" کا جائزہ لیا جائے تو آفاق صدیقی نے جابجا سیاسی حالات بیان کیے ہیں۔ اُن کے سامنے الگ وطن کے لیے جدوجہد کی گئی، تقسیم اور ہجرت کے واقعات پیش آئے، اقتدار کی جنگ لڑی گئی، نوزائیدہ مملکت کے معاملات اور مارشل لا جیسے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اُنھوں نے اپنی سیاسی بصیرت سے ان واقعات کو بہ حُسن وخوبی بیان کیا ہے۔ جب صدیقی (۳۰) نئے نئے پاکستان آئے تھے تو ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ :۔

"بارشوں کا موسم تھا دریائے سندھ میں اُونچے درجے کا سیلاب آیا۔ پرانا سکھر کے قریب بیگاری کینال میں ایسا شگاف پڑ گیا یا کمائی کے لیے ڈال دیا گیا کہ آس پاس کی آبادی ڈوبنے لگی۔ فوری طور پر ورکشاپ کے اسٹور ڈویژن کی طرف سے دس ہزار گز روپ کا آرڈر کراچی کی ایک فرم کو دیا گیا۔ جس میں سے ایک ہزار گز پہلی کھیپ ہمیں وصول ہوئی۔ ہیڈ اسٹور کیپر تاراچند نے اصرار کیا کہ بقیہ تار آنے سے پہلے دس ہزار گز کے بل پاس کر دیے جائیں مجھے اس گھپلے پر شدید اعتراض ہوا۔ تاراچند نے الگ جا کر سمجھایا تم ابھی نا سمجھ ہو ایسے ہی دن تو کمائی کے ہوتے ہیں۔"

آفاق صدیقی بتاتے ہیں کہ میرے بغیر سب کچھ ہو گیا۔ پارسی مکینکل انجینئر، ہندو اسٹور کیپر اور سیف اکاؤنٹنٹ نے ناجائز مال کما کر اپنے آپ کو سرخرو کر لیا اور مجھے برخاست کرنے کی دھمکی دی گئی۔

سیاست اور شعر و ادب کا باہمی رشتہ ہے کہیں سیاست ادب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے اور کہیں ادب سیاست پر اثر انداز ہوتا ہے۔ چونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور زندگی کے تمام شعبوں کی نمائندگی کرتا ہے اس لیے سیاست کو ادب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ صدیقی (۳۱) تعلیمی ادارہ میں سیاست کے نفوذ کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اس زمانے میں ہم نے اسلامیہ کالج سکھر کو بھی ادبی تقاریب کا مرکز بنایا، مگر درپردہ کچھ ایسی سازشیں ہوتی رہیں کہ اپریل ۱۹۶۱ء میں مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اب اسے خیر باد کہہ دینا چاہیئے۔ حالانکہ میں بڑی قلیل سی تنخواہ پر، لائبریری، گیمز، اسپورٹس اور تصنیف و تالیف کے شعبوں کو آگے بڑھا رہا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں کالج کا سب سے پہلا ضخیم مجلّہ بھی بڑی جگر کاری سے شائع کیا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔"

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی دو متضاد روّیوں کا نام ہے۔ ادب برائے ادب کو تخلیقی روّیہ اور ادب برائے زندگی کو تنقیدی رویہ کہہ سکتے ہیں۔ تخلیقی ادب میں ادیب کا نظریہ قاری کی نگاہ سے اوجھل رہتا ہے جبکہ تنقیدی برائے ادب میں سیاسی و سماجی افکار نمایاں نظر آتے ہیں۔ تخلیقی ادب میں استعارے اور کنایے سے کام لے کر حقیقت کو واقف حال بنا لیا جاتا ہے جبکہ تنقیدی ادب میں براہِ راست زندگی کے مسائل اور صورتِ حال کو اُجاگر

کیا جاتا ہے۔ آفاق صدیقی چونکہ حقیقت نگار ہیں اس لیے انھوں نے دوسری طرز کو اپنایا ہے۔ صدیقی (۳۲) ایک جگہ ایسی ہی صورتِ حال کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"پاکستانی سیاست کے بارے میں آج بھی میرا تاثر یہی ہے۔ جِس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ خصوصاً پاکستان کے پہلے وزیر لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ عبرت ناک والم ناک بھی۔ برسوں تو آئین سازی کا مرحلہ طے نہ ہوا۔ ۴۸ء سے مشرقی مغربی پاکستان کی سیاسی کشمکش نئے نئے شوشے چھوڑتی رہی۔ اردو اور بنگالی کا چکر الگ چلا۔ ادھر مغربی پاکستان کے چاروں میں بھی اختلافات کی خلیج بڑھتی گئی۔"

ناقدین میں ایک بڑا حلقہ یہ سمجھتا ہے کہ ادب میں سیاسی تصورات کا استحصال یا اخلاق و سماجی منشور کا پرچار نہیں کیا جانا چاہیے۔ ادب خود باشعور ہوتا ہے اور اچھا ادب غلط و نصیحت سے کام نہیں لیتا بلکہ ترجمانی کرتا ہے اور معاشرتی حُسن و قبح کو غیر محسوس طریقے سے قاری پر واضح کر دیتا ہے۔ اس لیے اگر اس میں ہدایت، نصیحت یا تنقید کی صورت میں سیاسی نظریات میں شامل کیے جائیں تو وہ خشک نعرہ بازی بن کر رہ جائے گا۔ ادب میں سیاست کے عمل دخل کے حوالے سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیۓ جِس میں صدیقی (۳۳) لکھتے ہیں :۔

"مارشل لا سے پہلے انجمن ترقی اردو کی سیاست میں ایسا موڑ آ گیا تھا جب بابائے اردو بڑے بے بس اور بے اختیار سے ہو گئے تھے۔ ایوب خاں نے مولوی صاحب کی مدد کی اور گویا سوکھے دھاتوں پر پانی پڑ گیا اس سلسلے میں بابائے اُردو نے اپنا ایک برجستہ اور فی البدیہہ قطعہ سُنایا:۔

ے
اوروں پہ میں بار ہو گیا ہوں
اپنی نظروں میں خوار ہو گیا ہوں
ایوب نے دیا ہے جو سہارا
میں برسرِ کار ہو گیا ہوں"

گو ادب سیاست سے پاک نہیں رہ سکتا لیکن بہر حال ادب میں سیاست کا دخول ایک منفی روّیہ ہے۔ اگر ادب میں سیاست کو داخل کرنا ناگزیر ہو تو اس کے لیے اصول و ضوابط کا احترام کرنا چاہیے۔ آفاق صدیقی کی خود نوشت "صبح کرنا شام کا" اس میں سیاست کا ذکر یہ ظاہر کرتا ہے کہ موصوف کو سیاست میں گہری دل چسپی تھی۔ اُن کی آپ بیتی کا مطالعہ کر کے انسان اس زمانے کی سیاست سے کما حقہ واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔

آفاق صدیقی نے اپنی خود نوشت میں جِس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں کی سماجی حقیقت اور معاشرے کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے خود نوشت کے ذریعے مختلف تہواروں، کھیلوں اور رسموں وغیرہ کے متعلق مفید میلانات دیے ہیں۔

- "جب میں اس قابل ہوا کہ بسم اللہ کی رسم ادا کی جائے تو اس نیک کام کے لیے بھی بڑا اہتمام کیا گیا۔ محمود میاں کی والدہ محترمہ (بڑی پیرانی) نے پھولوں کے ہار پہنا کر گود میں لیا اور ماتھے کو چوم کر صدقہ اُتارا" (ص۱۳)
- بچپن میں مجھے کہنانیاں سُننے کا بڑا شوق تھا۔ ابا جان اتنا چاہتے تھے کہ اکثر سرکاری دَورے پر جاتے تب بھی اپنے ساتھ رکھتے اور رات کو سونے سے پہلے کوئی کہانی، کوئی مزے دار نظم یا پھر بیتے دِنوں کا احوال ضرور سُناتے۔ (ص۱۰)
- اس وقت یہ بات ہماری سوچ سے باہر تھی کہ جو عیش تھانوں اور کوتوالی میں نصیب تھے وہ کہاں؟ (ص۱۸)
- ایک دن سُنا کہ پولیس والوں نے کسی غریب تانگے والے کو گرفتار کر کے بڑی مار لگائی ہے اس کا جرم یہ تھا کہ گھوڑے کو ہلکا سا چابک مار کر یہ صدا لگائی تھی کہ "چل بیٹا! ہٹلر کی چال۔" (ص۲۶)
- انھی دِنوں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی جِس کی ہولناکیوں نے یہ اثر دکھایا کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور اشیاء خوردنی کے شدید قلت نے غریب عوام کے ہوش اُڑا دیے۔" (ص۲۰)

آفاق صدیقی کی خود نوشت میں مذہبی رنگ اور خوش عقیدگی کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً صدیقی (۳۴) لکھتے ہیں :-

> "اس گاؤں کا نام شیخ پور کیسے پڑا؟ نانی اماں نے بڑے پیار سے بتایا "اس زمانے میں یہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ بس ہر طرف گھنا جنگل تھا۔ حضرت مخدوم محمد شیخ براق لنگر جہاں نے اس جنگل کو اپنے قدموں کی برکت سے شیخ پور بنا دیا۔"

- اپنی "بسم اللہ" کی تقریب کے حوالے سے آفاق صدیقی (۳۵) "صبح کرنا شام کا" میں رقم طراز ہیں:-

> "نمازِ عصر کے بعد ہمارے ابا کے اُستاد محترم علامہ عبدالحفیظ شیخ پوری تشریف لائے۔ وہ ایک سجی سجائی چوکی پر براجمان ہوئے۔ بڑی شفقت سے مجھے اپنے پاس بٹھایا۔ پیار بھرا ہاتھ پھیرتے رہے اور چند لمحوں میں وہ کچھ عطا کر گئے جو حیات و کائنات کا انمول اثاثہ ہے۔"

اپنی پہلی بیگم ناظمہ بیگم کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اُنھیں حج کرنے کی دُھن تھی مگر اصل مسئلہ رقم کا تھا۔ شاہد میاں کی شادی، کراچی میں اپنے مکان کا حصول اور چند ناگزیر اخراجات کے بعد اتنے پیسے کہاں تھے کہ جو حج کرنے اور کرانے کا سوچتے۔

اپنا ٹھکانہ یا مسکن کس ذی روح کو نہیں چاہیے۔ اس خود نوشت میں آفاق صدیقی نے اپنے ذاتی مکان کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کا بھی تذکرہ کیا ہے وہ(۳۶) کہتے ہیں:۔

"ناظمہ کو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ مکان چاہے کیسا ہو، آسمان ضرور نظر آنا چاہیے۔"

اس کیفیت کو اُنھوں نے اتنا محسوس کیا ہے کہ خود نوشت کا ایک پورا باب "مکان اور بے مکان" لکھ ڈالا ہے۔ ایک عام سرکاری ملازمت رکھنے والے فرد کا دُکھ بیان کرتے ہوئے صدیقی (۳۷) کہتے ہیں:۔

"جیسے جیسے سرکاری نوکری سے سبک دوشی کے دن قریب آتے گئے، مجھے یہ فکر لاحق رہی کہ کراچی میں اپنا کوئی ذاتی مکان ہونا چاہیے۔ کرائے کے مکانوں سے جی بیزار ہو گیا تھا۔"

اپنی خود نوشت میں آفاق صدیقی نے ہمارے معاشرتی روّیوں دھوکہ دہی اور استحصال کو بھی موضوع بنایا ہے۔ کس طرح سرکاری کمیٹیاں اور ادارے فلاح و بہبود کے منصوبے بناتی ہیں اور پھر حکومت تبدیل ہوتے ہی کیسے سب ایک دم سے ختم ہو جاتا ہے۔ عام آدمی کو انصاف ملنے میں اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ وہ خود اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

آفاق صدیقی نے اپنی خود نوشت میں اپنے خاندان کی خواتین کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔ اُن کی نانی، والدہ، بیگم، بہو، بیٹی ہوں یا درگاہ احسنی سے متعلقہ خواتین۔ وہ سب کا ذکر محبت اور عزت سے کرتے ہیں۔ ضعیف الاعتقادی یا توہم پرستی کا ذکر کہیں نظر نہیں آتا۔

خود نوشت میں کسی بھی جگہ اُنھوں نے شعوری طور پر اپنی طرف سے کچھ شامل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ صنف کی روانی، تسلسل اور سادگی اس کی صداقت کا مظہر ہے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے واقعات، مصائب اور حالات کو منِ و عن بیان کیا ہے جس سے کہیں تفاخر کا احساس نہیں ہوتا۔ "صبح کرنا شام کا" میں مصنف کے نفسی میلانات اور عادات و اطوار کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ آپ بیتی میں پاکستانی معاشرت میں پائی جانے والی منافقت اور اخلاقی تنزلی کا احوال بھی ملتا ہے۔ وہ مشاعروں اور ادبی محافل کا تذکرہ کچھ اس طرح سے کرتے ہیں

کہ اُن کی پوری ادبی زندگی کا نقشہ وضاحت کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ ابتدائی ابواب میں آفاق صدیقی نے اپنے خاندانی پسِ منظر، آباؤاجداد اور والدین کا تذکرہ کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی آپ بیتی میں اردو ادب کی سرکردہ شخصیات سے ملاقات کا احوال بھی درج کیا ہے۔ مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کی شخصیت سے متعلق اُنھوں نے دلچسپ خاکہ نگاری کی ہے۔ آفاق صدیقی نے اپنی خود نوشت میں ہجرت، فسادات اور ہجرت کے بعد مسلمانوں کو درپیش حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اُن کا تعلق فرخ آباد بھارت سے تھالہٰذا وہ جتنی بار بھارت یاترا کے لیے گئے اُس کا احوال اُنھوں نے تفصیل سے کیا ہے۔ وہاں کیا کیا جذباتی مناظر پیش آئے اور باقی ماندہ رشتے داروں سے وہ کب اور کیسے ملے سب کا تفصیل سے تذکرہ ملتا ہے۔

یہ آپ بیتی اُن کے حالات اور شعری و ادبی زندگی کی سرگزشت ہے۔ آفاق صدیقی کا اظہار و بیان پر مکمل اختیار حاصل ہے اور انھوں نے مشکل ترین کیفیات اور موضوعات کو بھی عام فہم انداز میں اپنی خود نوشت میں بیان کیا ہے۔ ان کی خود نوشت پڑھنے کے بعد قاری ان کی زندگی کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرلیتا ہے۔ کوئی بھی واقعہ یا معلومات غیر ضروری یا اضافی معلوم نہیں ہوتی ہے۔ آفاق صاحب کو لکھنے کا فن آتا تھا۔ آپ نے ہر واقعے کو نہایت عمدگی سے تحریر کیا ہے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی کے ساتھ مکمل انصاف برتا ہے۔ پیدائش سے لیکر آپ بیتی لکھنے تک کے تمام واقعات میں صداقت نظر آتی ہے۔ قاری آپ بیتی پڑھتے ہوئے، بوریت محسوس نہیں کرتا ہے۔ واقعات کو روانی اور تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ طوالت جو کہ کسی بھی فن پارے کو کمزور کردیتی ہے اور دلچسپی کے عناصر کو کم کردیتی ہے۔ مصنف نے اپنے خیالات اور ہم واقعات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے میں اپنی پوری مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اختصار کے واقعات کو بیان کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ہنرمندی اور کارگری کی ضرورت ہوتی ہے۔ آفاق صاحب کو یہ فن بہت عمدگی سے آتا تھا۔ خیالات میں روانی اور داخلی جذبات کا اظہار بھی پایا جاتا ہے۔ آپ نے بناوٹی اور غیر متعلقہ واقعات اور حقائق کو اپنی حالات زندگی میں شامل کرنے سے گریز کیا ہے۔ آپ کی تحریر اختصار کے باوجود جامع نظر آتی ہے۔ ان کی سرگزشت میں ہم نہ صرف ان کی زندگی کے اہم واقعات کے بارے میں جانتے ہیں بلکہ ان کے دور کے بہت سے مسائل اور حالات و واقعات کے بارے میں بھی آگاہی حاصل کرتے ہیں جن کے تقسیم ہند کے واقعات، سیاست اتار چڑھاؤں اور معاشرے کے دیگر امور شامل ہیں۔ آپ نے اپنے حالات و واقعات کے ساتھ انصاف برتا ہے۔ کوئی بھی واقعہ یا عمل ایسا نہیں ہے جو مصنوعی ہوں یا حقیقت سے دور نظر نہیں آتا ہے۔ آپ بیتی کو آپ بیتی کے انداز میں لکھنے کی بہترین مہارت نظر آتی ہے۔ آپ کی خود نوشت اپنی صنف کے تمام لوازمات پر پورا اترتی ہے۔

فصل سوم

"صبح کرنا شام کا" فنی اور اُسلوبی جائزہ

انسان نے جب اپنی ذات کا اظہار کرنا چاہا تو سب سے پہلے اس نے اشاروں، کنایوں اور علامتوں سے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچایا۔ جب زبان استعمال ہوئی تو حرف سے لفظ اور الفاظ سے جُملے بنتے چلے گئے۔ وقت کے ساتھ بولنے کا ڈھنگ اور اپنی ہر بات، احساس، خیال، عقلی نزاکتوں اور جذبات کو بہتر طریقے سے منتقل کرنے کے لیے انسان نے ادب کو منتخب کیا۔ ادب انسانی زندگی کا عکاس ہے۔ یوں انسانی زندگی کے غم، خوشی، شغل، رسم و رواج، جذبات، حقائق بتدریج ادب کا حِصہ بنتے چلے گئے۔ ادب میں ہیئت کے تجربات ہوئے اور اصناف کی تقسیم ہوئی تو انکشافِ ذات آپ بیتی کے حِصے میں آیا۔ "صبح کرنا شام کا" اردو ادب کے نامور نثر نگار، محقق اور شاعر آفاق صدیقی کی آپ بیتی ہے جو ۲۰۰۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس سے پہلے اس کا کچھ حصہ دوسری صورت میں شائع ہوا تھا۔ فنی نکتہ نظر سے "صبح کرنا شام کا" دیکھا جائے تو ایک ہمہ وقت متحرک ادیب کی آپ بیتی ہے جِس کی زندگی مسلسل محنت اور جدوجہد سے عبارت ہے۔

کسی بھی صنف کا فنی جائزہ لینے کے لیے سب سے پہلے اُس کے اسلوب پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ اسلوب میں زبان و بیاں سب سے اہم ہے۔ آپ بیتی کے لیے زبان و بیاں کی بہت اہمیت ہے کیونکہ اس میں ناول، ڈرامے یا افسانے کی طرح کہانی نہیں ہوتی۔ اس میں زیادہ اہمیت لکھاری کے انداز اور زبان کی ہے۔ آفاق صدیقی اپنی خودنوشت میں جب کسی واقعے یا صورتِ حال کو بیان کرتے ہیں تو اس کے لیے وہ دل چسپ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نثر قاری کے دل کے ساتھ ذہن کو بھی متاثر کتی ہے۔ جمالیات سے بھرپور یہ نثر آفاق صدیقی کی کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ خدائی تحفہ ہے۔ وہ صاحبِ زبان ہیں تبھی اُنھیں زبان پر پوری قدرت ہے۔ وہ اپنی بات کی تفہیم کے لیے خوب صورت تشبیہات اور استعارات کا استعمال کرتے ہیں۔

تراکیب اور تفصیل الفاظ کا استعمال نثر کو بوجھل اور غیر مانوس بنا دیتا ہے۔ آفاق صدیقی نے اس سے احتراز برتا ہے۔ اُن کے جُملے مختصر اور سادہ ہیں۔

"صبح کرنا شام کا" میں صیغہ واحد متکلم کو استعمال کیا گیا ہے۔ صیغہ واحد متکلم سے ایک تو مضمون کی صراحت اور وضاحت بہت اچھے طریقے سے ہو جاتی ہے دوسرا یہ خودنوشت کی بنیادی ضرورت بھی ہے۔ اپنی ذات کے اظہار کے لیے اُنھوں نے انفرادی انداز اپنایا ہے جس سے قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ یہی تسلسل قاری سے تخلیق کو

پڑھواتا ہے۔ اسلوب کو تنوّع اور دلکشی قاری کے ذوق و شوق میں اضافے کا موجب بنتی ہے۔ آفاق صدیقی کی تحریر میں ایک غیر رسمی انداز نمایاں تر ہے جس سے قاری کو مصنف کے ساتھ اپنائیت کا احساس پیدا کرنے کی سہولت ملتی ہے۔ ان کی تحریر باہم گفتگو جیسا تاثر پیدا کرتی ہے جس میں کسی علمی رعب یا تفاخر کا احساس موجود نہیں ہوتا۔ آفاق صدیقی کی خودنوشت کے نمایاں اوصاف درج ذیل ہیں:

- **واقعات نگاری:**

خودنوشت "صبح کرنا شام کا" میں واقعاتی انداز نظر آتا ہے۔ خودنوشت لکھنے کی ابتداء آفاق صدیقی نے روایتی انداز سے کی ہے۔ صدیقی (۳۸) رقم طراز ہیں:۔

> "آج مئی کی چار تاریخ ہے۔ میری تاریخ پیدائش۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں میری سالگرہ اس طرح منائی جاتی تھی کہ نانی اماں کلابتو کی ایک لچھی میں نئی گانٹھ لگالیا کرتی تھیں۔ جب تک وہ زندہ رہیں یہ سلسلہ چلتا رہا۔"

موضوع کی یک رنگی کے باوجود خودنوشت میں رنگارنگی موجود ہے۔ کہانی پن یا واقعاتی انداز کسی بھی صنف میں دل چسپی کے عنصر کو کم نہیں ہونے دیتے۔ شمس الرّحمٰن فاروقی (۳۹) نے اس صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "کہانی پن اور دلچسپی ایک ہی شے ہے۔" آفاق صدیقی کی خودنوشت میں واقعہ نگاری کی بدولت قاری اور تحریر کا فکری رابطہ بر قرار رہتا ہے۔ مثلاً صدیقی (۴۰) کا یہ انداز دیکھیے:۔

> "تھانے کے سامنے ہی ہمارا اسکول تھا۔ صبح اسکول جاتے وقت ایک آنہ دیا جاتا تو میں ابا سے ضد کرتا کہ ایک پیسہ اور دو۔ سبب یہ تھا کہ پانچ پیسے کی پاؤ بھر گلاب جامنیں ملتیں جو ہم ضرور کھاتے اور اپنے دوستوں کو کِھلاتے۔ پوریاں کھانے کا شوق اسی طرح پورا ہوتا کہ ایک خوب صورت کامنی سی لڑکی جس کا نام ساوتری تھا اکثر اپنے پتاجی کی دکان پر لے جاتی جہاں گرم گرم پوریاں ہماری منتظر ہوتیں۔"

خودنوشت میں کئی مقامات پر واقعہ نگاری کی جھلکیاں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔ اس خودنوشت سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ آفاق صدیقی کو زبان و بیان پر دسترس ہے۔ اُنھوں نے اپنی یادوں کے خزانے کو فنی پختگی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ یہ بنیادی طور پر اُن کی اپنی کہانی ہے لیکن اپنے ساتھ ساتھ اُنھوں نے کئی کرداروں اور واقعات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اپنے احباب، رفقائے کار اور اعزّہ کے مابین پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات کو اُنھوں نے قاری کے لیے دل چسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ صدیقی (۴۱) ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

"ایک دن ایسا ہوا کہ کوئی انسپکٹر صاحب اسکول کا معائنہ کرنے آئے اور ایک خالی جماعت میں داخل ہو کر طالب علموں سے پوچھا "کس کا پیریڈ ہے؟" سب نے مِلی جُلی آوازوں میں بتایا "سر درد کا" انسپکٹر صاحب بہت ناراض ہوئے اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے شکایت کی جنھوں نے یہ کہ کر ناراضگی دور کر دی "سر ہمارے اردو ٹیچر بڑے شاعر ہیں، دردؔ ان کا تخلص ہے اور دردؔ سعیدی کہلاتے ہیں۔"

واقعہ نگاری کی بنیاد کہانی پن پر اور کہانی کی بنیاد انسانی زندگی پر ہوتی ہے۔ اس میں روز مرّہ کے واقعات بیان ہوتے ہیں۔ "کہانی پن" قاری کے لیے ذہنی غذا ہے۔ چھوٹے چھوٹے قصے، کہانیاں، مناظر قاری کے لیے دل چسپی اور تجسّس کا سامان بنتے ہیں اور خود مصنف بھی کہانی کی رَو میں بہ کر روانی سے آپ بیتی بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ صدیقی (۴۲) ایک جگہ رقم طراز ہیں:۔

"میری معاشی مصروفیات کا وہی عالم رہا کہ پورا دن درس و تدریس میں بسر ہوتا تھا۔ اس عرصے میں ناظمہ کا وحشت منزل میں اکیلے رہنا بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ گرمیوں کا موسم آگیا تو مجھے فکر ہوئی کہ ناظمہ کو بڑی تکلیف ہو گی۔ اِس لیے ہم بھائی حکیم کے بنگلے میں چلے گئے۔"

آپ بیتی دراصل واقعہ نگاری ہی ہے اور خودنوشت کی تعمیر میں مختلف واقعات سے مدد لی جاتی ہے مگر واقعات کی بہتات بھی خودنوشت کو غیر دل چسپ اور طویل بنا دیتی ہے۔ صرف اہم اور منفرد واقعات کو ہی بیان کرنا چاہیے جس سے موضوع کے لحاظ سے آپ بیتی نگار کی زندگی کے چھُپے ہوئے گوشے سامنے آئیں اور انفرادیت نمایاں ہو۔

- **منظر کشی:**

منظر کشی کسی بھی صنف کی پیش کش کا اہم جُزو ہے۔ کسی چیز، کسی صورتِ حال یا کسی کیفیت کا بیان اس انداز سے کیا جائے کہ اس کی تصویر قاری کی آنکھوں کے سامنے متحرک ہو جائے، اس کا نام "منظر کشی" ہے۔ ماحول یا منظر کشی آپ بیتی نگار دو طرح سے سامنے لاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ سماج کے نقشے سامنے لاتا ہے یعنی گلیاں، بازار، سڑکیں اور عمارات یا تقریبات وغیرہ کی حالت کو پیش کرتا ہے۔ منظر کشی کرتے ہوئے فطرت نگاری اور تجسیم نگاری سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ آفاق صدیقی نے اپنی خودنوشت سے تحریر کو دلکش بنایا ہے۔ صدیقی (۴۳) لکھتے ہیں:۔

"ابھی میں یاقوت گنج کی گمٹی کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ہر طرف کالے کالے بادل چھاگئے اور تھوڑی دیر بعد موسلا دھار بارش ہونے لگی کہ سڑک دریا بن گئی۔ سردیوں کا موسم، بھیگا بدن اور تند و تیز ہوا ایسی کہ سر سے پاؤں تک

کپکپاہٹ ہونے لگی۔ اندھیرا اتنا خوفناک کہ سڑک کے دونوں طرف کے
درخت کالے کالے دیو بن کر ایک قدم بھی آگے بڑھنا دوبھر کیے ہوئے
تھے۔"

قدرتی مناظر پیش کرتے ہوئے عموماً مناظر کی پیش کش مصور کی طرح کی جاتی ہے اور کسی خاص فن کی ظاہری خصوصیات اور اس کے روشن اور تاریک پہلو کو ہو بہو پیش کر دیا جاتا ہے۔ دوسرا مناظر کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ کہانی یا کردار پر اس کا اثر نمایاں ہو جائے۔ جیسا کہ اُوپر بیان کیے گئے منظر میں آپ بیتی نگار پر اس کا کیا اثر ہوا صدیقی (۴۴) لکھتے ہیں:۔

"گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا سفر جب چار گھنٹوں میں طے کر کے جب گھر میں داخل
ہوا تو میری حالت دیکھ کر سبھی پریشان ہو گئے۔ میں بُری طرح کانپ رہا تھا
اور سردی کی شدت بڑھتی جارہی تھی لیکن گھر میں گرم کپڑے بھی کہاں
تھے۔ جیسے تیسے لکڑیاں جلائی گئیں اور آگ کے سہارے باقی ماندہ رات
کاٹی۔"

صحیح ادبی ذوق رکھنے والا لکھاری واقعات و مناظر، کردار کی فطرت سے ملا کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ صنف میں ایک نئی زندگی آجاتی ہے۔ صدیقی (۴۵) ایک اور جگہ کس طرح تصویر کشی کرتے ہیں ملاحظہ کیجیے:۔

"اسکول سے باہر نیم کے گھنے درختوں کے سائے میں ایک تلک دھاری
پنڈت جی پھول سے بچوں کو لیے بیٹھے تھے اور ہندی کی کتاب پڑھارہے
تھے۔ میں نے قریب جا کر کہا "نمستے پنڈت جی "اُنھوں نے جواباً ہاتھ جوڑ کر
میرے سلام کا جواب دیا اور بولے "بھیّا! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

منظر نگاری کے ذریعے کسی خاص زمانے کو یادداشت سے نکال کر بیان کی خوبی کے ذریعے پھر سے زندہ کیا جا سکتا ہے۔ مصنف کے پاس یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ کسی منظر کی کامیاب تصویر کشی کر سکے۔ صدیقی (۴۶) کا ایک منظر نامہ اسی تناظر میں دیکھیں:۔

"کمال گنج سے ہمارے گاؤں کے دو راستے ہیں۔ ایک پکی سڑک والا اور
دوسرے کھیتوں پگڈنڈی والا جو شارٹ کٹ ہے۔ اب ہم بھیگتے بھیگتے سے
کھیتوں کے درمیان اپنے گاؤں کی طرف چل رہے تھے۔ سریا سے آگے
بڑھے تو دائیں جانب وہی تاریخی آثارِ قدیمہ، باؤلی، چبوترہ اور مسجد اور پھر
آگے کی گھنی آبادی، منر ومالی کی دکان، شیل چند کی چوپالی، ناتھو رام کا گھر،
لہلاتے کھیتوں کے بیچ پانی کی اونچی اونچی پختہ نالیاں، سامنے احسن میاں کا

مزار، پکا کنواں، کھیتوں کے بیچ بیری والا قبرستان، بہت بڑا چبوترہ اور نیم کے
درخت کا شامیانہ"

اسی طرح کا ایک اور (۴۷)منظر دیکھیں:۔

"جس دن یہ خبر ملتی کہ فوجیوں کو محاذِ جنگ پر بھیجا جا رہا ہے تو ان کی رخصتی کا
منظر دیکھنے ہم ضرور جاتے۔ وکٹوریہ گراؤنڈ سے چھاؤنی کے ریلوے اسٹیشن
تک سڑک کے دونوں طرف عورتوں، مردوں، بچوں اور نوجوان طالب
علموں کا ہجوم رہتا۔ جن کو قطار اندر قطار کھڑا رہنے کے لیے ملٹری پولیس
موجود رہتی۔ آگے آگے بینڈ باجے والے فوجی بینڈ کا دستہ آتا اور اس کے
پیچھے تین چار سو فوجی جوانوں کی لیفٹ رائٹ"

کوئی بھی منظر کرداروں کی شخصیت کو مصورانہ طرز میں ابھارنے اور اس کے منفرد پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں مدد دیتا ہے۔ منظر کشی کے ذریعے کردار کی شخصیت نکھر کر سامنے آتی ہے۔ چونکہ آپ بیتی نگار نے منظر کا خود مشاہدہ کیا ہوتا ہے اس لیے وہ اسے سرسری بیان نہیں کرتا بلکہ اس کی گہرائی میں اُتر کر اُسے محسوس کر کے پسِ منظر کی رُوح تک کو بیان کرتا ہے۔ فن کارانہ منظر کشی سے صنف میں دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔

- **جذبات نگاری:**

ادب احساسات کا بیانیہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب سے منسلک ہر فرد حساس اور جذباتی ہوتا ہے۔ انسان اپنے جذبات کی ترجمانی یا اظہار نہ کر پائے تو شاید پتھرا کر رہ جائے۔ غم اور خوشی کے جذبات جبلّت اور فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ جذبات ہی ہیں جن کے ذریعے کوئی بھی فرد اپنے طرزِ زندگی اور اعمال کا تعیّن کرتا ہے۔ آپ بیتی چونکہ فرد کی اپنی کہانی ہوتی ہے اس لیے اس میں خلوص، وفا، ایثار، دوستی، کینہ اور نفرت و عداوت میں کیفیات کا اظہار جذبات کے ذریعے ملتا ہے۔ محاذ جنگ پر جب فوجی نوجوانوں کو بھیجا جاتا تو آفاق ان کی رخصتی کے مناظر دیکھنے ضرور جاتے تھے، صدیقی (۴۸) رقم طراز ہیں:۔

"سڑک کے دونوں جانب سے فوجیوں کے گھر والے اور تماش بین پھول
نچھاور کرتے یا موٹے موٹے آنسو، کچھ مائیں، بہنیں اور بڑی بوڑھیاں پھوٹ
پھوٹ کر روتیں اور بے ہوش ہو جاتیں، لیکن فوجی جوانوں کی پیش قدمی
میں کوئی فرق نہ آتا۔ باقی یہ ضرور تھا کہ ان کے چہروں پر بھی جدائی کے
دُکھ درد کی چھاپ ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی اور کسی کسی کی آنکھوں میں آنسو
بھی تیرنے لگتے۔"

ایک بات طے ہے کہ اگر کسی بھی صنف بشمول آپ بیتی میں اگر جذبات نہ ہوں تو کردار سپاٹ ہو جائیں گے۔ لکھنے ولا معمولی جذبات کو بھی حقیقی اور رومانوی عناصر کی آمیزش اور پیش کش سے متاثر کُن بنا سکتا ہے۔ فرد کی زندگی جذبات سے بھری ہوتی ہے۔ کوئی واقعہ حُزینہ اور کوئی نشاطیہ۔ غم اور خوشی کی دھوپ چھاؤں متوازی چلتی ہے۔ جذبات نہ ہوں تو رُوداد ایک سپاٹ کہانی بن کر رہ جائے۔ ایک اچھا آپ بیتی نگار بہترین جذبات نگار بھی ہوتا ہے۔ آپ بیتی "صبح کرنا شام کا" مسرّت و غم کے مِلے جُلے جذبات کا بیانیہ ہے۔ آفاق صدیقی نے اعتدال سے کام لے کر کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ صدیقی (۴۹) نے مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھیں کس طرح اپنے احساسات کو خوب صورتی سے قلم بند کیا ہے:-

> "کئی مہینوں تک ہمارا گھر گہری اُداسیوں میں ڈوبا رہا کوئی اور جیتا جاگتا کھلونا ہوتا تو ممکن تھا ہمارے دلوں میں ویرانی اور سناٹے کا ڈیرہ زیادہ دِنوں تک نہ رہتا۔ اپنی والدہ محترمہ کی طرح ناظمہ بڑی عبادت گزار تو پہلے ہی سے تھیں۔ گڑیا کی جدائی میں یہ تو حال ہو گیا کہ نماز پڑھ کر آنسو برساتے ہوئے دعائیں کرتیں اور زیادہ سے زیادہ وقت قرآن پاک کی تلاوت میں صَرف ہوتا۔"

انسانی جذبات کو لفظی حُسن دے کر بیان کرنے کے لیے "خود نوشت" بہترین صنف ہے۔ قاری کی جذباتی وابستگی صنف کی مقبولیت کا باعث بنتی ہے۔ جذبات نگاری کے حوالے سے "صبح کرنا شام کا" صدیقی (۵۰) کا ایک اور منظر دیکھیں:-

> "ناظمہ کے بغیر زندہ رہنا کتنا کٹھن تھا ایک ایک ساعت بھیانک اور درد میں ڈوبی ہوئے لگنے لگی کہ سب سے الگ تھلگ رہ کر میں چاہتا تھا کہ بس عہد رفتہ کی یادوں میں کھویا رہوں۔"

اظہارِ خیال کی جتنی اصناف دنیا میں رائج ہیں کہ سب جذبات کے اظہار کا لطیف اور پُر تاثیر ذریعہ ہیں۔ یہ ادیب ہی ہیں جو انسانی جذبات و محسوسات کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ صدیقی (۵۱) کی جذبات نگاری کا ایک اور مرقّع ملاحظہ فرمایئے:-

> "ابا کے مصائب و آلام بڑھتے ہی جاتے تھے۔ بڑے کنبے کی کفالت کا احساس، جوان بھائی کی موت کا صدمہ، بھتیجی کی تباہی کا کرب، اپنی شریکِ حیات کا ذہنی عدم توازن کی الجھنیں اور بڑے بیٹے کی دربدری کا غم۔ شعر و ادب سے جو رشتہ پہلے تھا وہ اب صرف اس حد تک رہ گیا تھا کہ کبھی کبھار کوئی شعر ان کی زبان پر آجاتا۔ مثلاً یہ اشعار:

؎ پریشانی ہماری کا کل محبوب جانے ہے

پریشاں کی پریشاں، پریشان خوب جانے ہے"

جذبات نگاری ایک مثبت جذبہ ہے جو کم و بیش ہر ذی روح کو متاثر کرتا ہے۔ اندازِ بیاں ابلاغ کا مؤثر ذریعہ ہے۔ اسے ہم حقائق کے بیان کے ساتھ جذبات کو چھپانے اور افشا کرنے دونوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ شعر و ادب کی دنیا میں جذبات نگاری کرتے ہوئے زبان کے درست استعمال کی حد درجہ ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ طعن و تشنیع جذبات نگاری کی صورت کو مسخ کر دیتے ہیں جبکہ کیفیات اور محسوسات کو لے کر مصنف بہتر انداز میں جذبات نگاری کر سکتا ہے۔

- **ادبی عناصر:**

(الف)

آفاق صدیقی نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ بلکہ شروع کے ایّام میں وہ شاعر ہی تھے اور گھریلو ادبی ماحول سے متاثر ہونے کے ساتھ جگر مراد آبادی کے مشاعرے سُن سُن کر وہ شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ اُن کے شعری مجموعوں میں غزل کے علاوہ حمد اور نعت کے مجموعے بھی موجود ہیں۔ لیکن خود اُنھیں غزل ہی پسند تھی۔ "صبح کرنا شام کا" آپ بیتی کا غاز ایک شعر سے ہی ہوتا ہے:-

؎ یہ کیا خبر تھی شعلہ فشاں ہے تیری گلی

ہم آ گئے تھے سایہ دیوار دیکھ کر

یہ شعر اُن کی اپنی خوش خطی میں آپ بیتی کے آغاز میں موجود ہے۔ خود نوشت کے آغاز میں جو پہلا عنوان ہے وہ بھی ایک شعر کا مصرعہ ہے جو شاد عظیم کا ہے:

؎ سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی

اس کے علاوہ تقریباً ہر عنوان کے آخر میں یا درمیان میں پورا شعر یا شعر کا ایک مصرعہ موجود ہے۔ مندرجہ ذیل میں کچھ منتخب مصرعے اور اشعار دیے جارہے ہیں:

- ؎ رحمٰن دھاگا کریم کا مت توڑو چٹکائے
  توڑے سے پھر جُڑے نہیں، جُڑے گانٹھ پڑ جائے (۱۴۱)
- ؎ ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
  احساسِ مروّت کو کُل دیتے ہیں آلات (۱۴۲)
- ؎ کہیں ایثارِ غم جاتا ہے ضائع
  چمن شاداب ہے شبنم نہیں ہے (۱۴۵)

- ؎ چوکھٹے قبر کے خالی ہیں انھیں مت بھولو
جانے کب کون سی تصویر لگادی جائے (۱۵۱)
- ؎ خوش رہیں تیرے دیکھنے والے
ورنہ کس نے خدا کو دیکھا ہے (۱۴۸)
- ؎ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا
پتاٹوٹے ڈال سے لے گئی پون اُڑائے
- ؎ اب کے بچھڑے کب ملیں گے دُور پڑیں گے
محبت کی بازی میں ہے جیت کس کی ہو جائے
- ؎ جو جیتے ہوئے داؤں دانستہ ہارے (۵۸)
- سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
؎ ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
- بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
؎ تمام عمر کٹی بے نوا کی طرح
- چمن میں خاک اڑاتے پھرتے ہیں صبا کی طرح
؎ نشانِ راہ نہ پایا تو دشتِ غربت میں
- ہم اپنی راہ بتاتے چلے ہوا کی طرح (۸۴)
- ؎ اپنی اپنی وسعتِ فکر و نظر کی بات ہے
جس نے جو عالم بنا ڈالا اسی کا ہو گیا

خودنوشت کے اختتامی صفحے پر ایک شعر درج ہے جو آفاق صدیقی کی اپنی خوش خطی میں ہے:

- ؎ اسیر فکر و نظر ہے ہر آدمی آفاقؔ
کوئی زمیں کی طرح کوئی آسماں کی طرح

(ب)

شاعری کی طرح نثر میں بھی اُنھوں نے کئی جگہ خود کلامی کے انداز میں عمدہ اختصاریے بیان کیے ہیں۔

- خلقِ خدا اللہ کا کُنبہ ہے اور انسانیت کی بہترین خدمت یہ ہے کہ پیار محبت، باہمی رواداری، ہمدردی، ایثار کے جذبے کو سیاسی کشیدگی پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔ (ص ۱۴۱)

- یاروں کی یاری میں اکثر کڑی آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ وفاداری شرطِ استواری آسان کام نہیں۔ (ص۹۵)
- جنگ کے شعلوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے جانادراصل پیٹ کی آگ بجھانے کا ایک بہانہ تھا۔ (ص۲۶)
- خستہ حالی تو اب اس دیس کی عبادت گاہوں، مزارات اور بیشتر تاریخی عمارتوں کا مقدر بن چکی ہے۔ (ص۱۴۴)

(ج) روزمرّہ محاورات اور ضرب الامثال:

روزمرّہ بول چال اور اسلوب بیان کو کہتے ہیں جو خاص اہلِ زبان استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بلاناغہ کی جگہ روز روز نہیں کہا جاسکتا۔ محاورہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا مرکب ہوتا ہے اور لغوی معنی کی بجائے مجازی معنی دیتا ہے۔ مثلاً پانی پینا محاورہ نہیں کیونکہ یہ حقیقی معنوں میں ہے جبکہ غصہ پینا اور آنسو پینا محاورے شمار ہوں گے۔ کوئی جملہ، شعر یا مصرعہ جو زندگی کے بارے میں کسی خاص اصول، حقیقت یا روّیے کو بلیغ اور جامع بیان کرے ضرب المثل کہلاتا ہے۔ ضرب الامثال کی ذیل میں آفاق صدیقی کی خودنوشت "صبح کرنا شام کا" میں سے روزمرہ محاورات جان سے جانا، جی کڑا کرنا، چڑھ جا بیٹا سُولی رام بھلی کرے گا، چین سے سونا، فقرے چُست کرنا، آپے میں نہ ہونا، کانوں میں رس گھولنا، دلی مراد پوری ہونا، دن گِننا، آواز کا جادو جگانا، جیسے تیسے کرکے، جی اچاٹ ہونا، خطرے سے خالی نہ ہونا، راگ الاپنا، بستہ گول کرنا، رنگ میں رنگ لینا، رختِ سفر باندھنا، جم کر بیٹھا، داغ بیل ڈالنا، ناخن سے ماس الگ ہونا، دل باغ باغ ہونا، چھوٹی مچھلیاں، سٹی گم ہونا، جی کڑا کرنا۔

خودنوشت میں آفاق صدیقی نے کسی اور کردار کا ذکر کرتے ہوئے اس سے اُسی کا لہجہ اور زبان بُلوائی ہے۔

- مثال کے طور پر ریل کے سفر کے دوران غنڈہ ٹائپ ہم سفر کی گفتگو دیکھیں:

  "اپن تو پانچ پتے دے کر دس ہجار لے جانے والوں میں سے ہے۔"

  (ص۷۹)

- اسی طرح ایک اور جگہ آفاق صدیقی کے والد کوتوالی میں میز کُرسی ڈالے کچھ کام کر رہے تھے کہ چوکیدار کو آواز دی اور کہا کہ کمرے میں سے پیک دان اُٹھالائے۔ وہ اُٹھالایا اور قریب آکر بولا:

  "ساب! جامیں تو کاؤ بدماس نے تھوک دیو"

لفظیات:

لفظیات ایک مسلسل "عمل" کا نام ہے۔ ان میں جان ہوتی ہے، ان کی حرمت ہوتی ہے اور قسمت ہوتی ہے۔ یہ پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں، پھیلتے بھی ہیں، زندہ رہتے ہیں اور بلآخر وقت کے ساتھ ساتھ مَر بھی جاتے ہیں یا متروک ہو جاتے ہیں۔ یہ لسانیات کا دل چسپ سلسلہ ہے۔ الفاظ رائج ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ کئی وجوہات کی بنیاد پر غیر مروّج ہو جاتے ہیں۔ فصیح اور غیر فصیح کا فرق آنے لگتا ہے۔ زبان کوئی بھی ہو نئے الفاظ اس میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ ادب، شاعری، ثقافت، لسانیات اور عمرانیات سے متعلق لوگ اس مطالعے میں کافی دل چسپی رکھتے ہیں۔

"صبح کرنا شام کا" میں آفاق صدیقی نے اُردو کے خالص الفاظ کے ساتھ فارسی، انگریزی اور ہندی الفاظ سے استفادہ کیا ہے۔

فارسی الفاظ:

اَلم انگیز، طیّارہ، ضیافت، یادِش بخیر، نذرانہ، دارالسلطنت، خوش دامن، لحد، افسردہ خاطر، عہدِ رفتہ، کلماتِ تحسین، عشائیہ، رکین بسیرا، راقم اطروف، برخودار۔

ہندی الفاظ:

کتھا، کرتا دھرتا، رَوارَوی، سَنگی ساتھ، گیان، دھیان، رہتک، بٹوارہ، تبکھی، دیش، پگڈنڈی، ہیکڑی، دھان پان، جیجا جی، سہاگن، ناٹک، رام لیلا، گمٹی، جنتا، ہوتی، چھپر کھٹ، گھیا، سلائی، بھوجن، پتاجی، گیہوں، بھجن، منڈل، رت جگے، چومکھی، درشن، کارن۔

انگریزی الفاظ:

جمبو جیٹ، ٹرانسفر، پوسٹنگ، فائٹ، بوٹنگ، مائک، کرنسی، ریڈ بلڈ، ویٹنگ رُوم، جنکشن، فیملی پلاننگ، میٹنگ۔

عربی الفاظ:

الامان، الحفیظ، واللہ اَعلَم

آفاق صدیقی صاحبِ زبان تھے اس لیے اُنھوں نے بعض ایسے الفاظ استعمال کیا ہیں جو عام لوگ عام گفتگو میں اب کم کم ہی استعمال کرتے ہیں جیسے: منہمک، کوفت، کافُور، مبیّن، عُذر، حالِ زار، کلابتو، ترائی، چنچل، سر تاج، جاں بلب، دلجَوئی، مغموم۔

مرکب الفاظ:

دو یا دو سے زیادہ بامعنی الفاظ کا مجموعہ مرکب کہلاتا ہے۔ اور ایسا مرکب جو صنف اور موصوف سے مل کر بنے گرامر کی زبان میں مرکب توصیفی کہلاتا ہے۔ جیسے:

صفِ اوّل، درویشِ کامل، وعدۂ فردا۔

مرکب اضافی اور عطفی:

مرکب اضافی پورا جملہ نہیں ہوتا بلکہ جملے کا جُزو بنتا ہے۔ دو اسم میں تعلق سے مرکب اضافی بنتا ہے۔ اگر مرکبات کے درمیان میں "واؤ" ہو تو مرکب عطفی بنتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

جوڑے توڑے، تحائف تبرّکات، سن رسیدہ، کشدہ قامت، جواں فکر، خوش گلو، سرکشیدہ، خود رفتگی، تنگی ترشی، گریہ زاری، تن تنہا، من جوہی، ہلکا پھلکا، ہجرا، ناخستہ حال، خالی خولی، صبر وشکیب، آہ وفضاں، شور وغوغا، نذر ونیاز، غم گسار ومددگار، غم زدہ وبے قرار۔

فصاحت وبلاغت:

فصاحت وبلاغت ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے نظر آتے ہیں۔

فصاحت:

فصاحت گفتگوں میں حسن پیدا کرتی ہے۔ اگر کلام موزونیت، عمدگی، بیان حسن اور خوش کلامی پر مشتمل ہو اور اس میں علم بیان کی جو تراکیب استعمال کی جائیں ان میں غیر مانوس تفصیل نہ ہو اور وہ درست الفاظ پر مشتمل ہو تو ہم اسے فصاحت کا نام دے گے۔ جس کے معنی خوش بیانی کے ہیں۔ ایک عام مفہوم میں فصاحت سے مراد کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جن ناگواری نہ پیدا کریں اور نہ ہی ایسے الفاظ ہوں جو نامانوس ہوں جن کا استعمال کلام میں ہم آہنگی کو ختم کر دے بلکہ ایسے الفاظ کا استعمال کیا جائے جو کلام حسن اور خوبصورتی پیدا کریں۔

فصاحت اور بلاغت دونوں کو استعمال کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کلام میں ان دونوں کی وجہ سے ان الفاظ کا انتخاب کیا جائے جو بولنے، سننے اور لکھنے میں مناسب معلوم ہوں۔ اور کلام معیاری اور مستند محاورے کے مطابق ہو۔ فصاحت کوئی الگ علم نہیں ہے البتہ شعر وادب میں استعمال کے وقت جمالیاتی پہلوؤں کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے جِس کے لیے فصاحت اور بلاغت کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ فصاحت کا تعلق لفظ کے حسن خوبی سے ہے اور بلاغت معنوی حسن وخوبی سے متعلق ہے۔ اس مفہوم کو ایک شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے:

اثر ہو سننے والوں پر بلاغت اس کو کہتے ہیں

سمجھ میں جلد جو آ جائے فصاحت اس کو کہتے ہیں

بلاغت کو بطور اصطلاح الگ استعمال کیا جائے تو اس میں تین شاخیں آتی ہیں:

۱۔ علمِ معانی

۲۔ علمِ بیان

۳۔ علمِ بدیع

آیئے اب ان علوم کے تناظر میں آفاق صدیقی کی خود نوشت "صبح کرنا شام کا" کا فنی جائزہ لیتے ہیں:

صنعتِ تضاد:

کلام میں دو ایسے کلمے لائے جائیں جو معنوی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہوں جیسے ہنسنا رونا، سیاہی سفیدی وغیرہ۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

- کچھ چیزوں کی ستائی اور کچھ کی مہنگائی ہے۔ (۸۱)

اوپر اوپر پھول کھلے بھیتر بھیتر آگ۔

- اِدھر شیخ مجیب کا بول بالا اور اُدھر بھٹو صاحب کا۔ (۸۹)

کہاں ایک ناشگفتہ کلی اور کہاں ایک مرجھایا ہوا پھول۔

- اُن حضرت نے میرا فیوز اُڑا دیا۔ (۹۱)

مجاز مرسل

- میں نے کبھی کسی عدالت کا مُنھ نہ دیکھا تھا۔

مجاز مرسل

- لشکرِ جرار کو شکستہ خوردہ ہونا پڑا۔

مجاز مرسل

- انمول رفاقتوں کے ہیرے۔

مجاز مرسل

- میرے سینے میں عجیب ساز لزلہ آ رہا ہے۔ (۱۴۵)

کنایہ

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بارونق بستی اپنی ویرانی پر ماتم کناں ہے۔ (۸۶)

کنایہ

ہمارے نُورِ نظر کی ولادت ہوئی۔

کنایہ

- میرے دل کی اُجڑی بستی پھر آباد ہو گئی۔

کنایہ

- گھر میں تن تنہا، کچھ کھویا کھویا سا رہتا جیسے اپنا وجود کہیں گُم ہو گیا ہو۔ (۱۴۸)

کنایہ

- غریبی ناداری اور بے سر و سامانی کے بھیانک طوفان نے دل و دماغ کی ساری چوُلیں ہلا دی تھیں۔

کنایہ

دُوری و مہجوری اور پھر دیدہ و دل کی ناصوری کی ایسی کرب ناکی سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔

کنایہ

ٹرام پر کھٹا کھٹام کی موسیقی تھی۔

کنایہ

- کربِ تنہائی نے زندگی سے کچھ بیزار بیزار سا کر دیا۔ (۴۵)

استعارہ

- اُس کی گود میں ایک خوب صورت پھول کِھلا ہوا تھا۔

استعارہ

- مندرجہ بالا لفظیات اور امثال آفاق صدیقی کی بصیرت، بصارت اور تبحرِ علمی کا بین ثبوت ہیں۔

استعارہ

- عشائیہ توشِ جاں فرما کر ہم پچھواڑے کے بزرگوں کی محفل میں شریک ہو گئے۔

استعارہ

- پھر اُس نے اپنی رام کہانی سُنائی۔

استعارہ

- معلوم نہیں کہ پولیس والوں نے کون سانسخہ استعمال کیا کہ اُن کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔

استعارہ

- اُس کام کے لیے آپ کو بھی گھیروں گا۔ (۷۵)

استعارہ

- دامنِ دل میں سمیٹ کر۔

استعارہ

- شاعری کا روگ تو مفت میں لگ گیا تھا۔ (۱۹)

تکرارِ لفظی

جنگل جنگل، صحرا صحرا، بستی بستی گھومتا رہا۔

تکرارِ لفظی

- آن کی آن میں موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ (۸۴)

تکرارِ لفظی

- ایک پھُول سی بیٹی اس کی ماںتا کامرکز تھی۔ (۱۲)

تکرارِ لفظی

- آن کی آن میں دھلم سے زمین پر جاگرے۔ (۱۷)

تکرار لفظی

- قیس صاحب پورے جسم سے شعر پڑھتے تھے اور پُکار پُکار کر داد وصول کرنا ان کا حق تھا۔

حُسنِ تعلیل

- برطانوی راج کا سورج ڈھلنے لگا تھا۔

حُسنِ تعلیل

- میرے پاس تو سر چھپانے کو جھونپڑی تک نہ تھی۔ (۴۵)

مجاز مرسل

- قریب ہی کی ایک مسجد سے رشتہ جوڑا۔

مجاز مرسل

ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ (۴۱)

تشبیہ

- گویا شاہی اور دل شاہانہ دونوں میسّر تھے۔ (۱٦)

آفاق صدیقی نے اپنی خود نوشت کو طوالت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اُنھوں نے تعلّٰی کا روّیہ اپنایا بھی نہیں اپنایا۔ ایک خاص قسم کی علمیت اور درویشی اُن کی تحریر میں نمایاں ہے۔ وہ جس موضوع کو چھیڑتے ہیں اُس پر جامع انداز میں بات کر کے غیر ضروری تفصیل سے گریز برتتے ہیں۔ اُن کے ہاں کہیں بھی غیر متعلقہ نکتہ زیرِ بحث نظر

نہیں آتا۔ الفاظ اور فقرات دونوں میں انفرادیت نمایاں ہے۔ پیچ دار اُسلوب سے اغماض برت کر اُنھوں نے سادگی سے اپنی بات کہی ہے۔ اسلوب کی یہ سادگی قاری کو ابلاغ کی منازل تیزی سے طے کرا دیتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ صدیقی (۲۰۰۰ء)، صبح کرنا شام کا، کراچی، طاہر پبلی کیشنز ص ۱۱

۲۔ ایضاً، ص ۱۲

۳۔ ایضاً، ص ۱۲

۴۔ ایضاً، ص ۱۲

۵۔ ایضاً، ص ۱۳

۶۔ ایضاً، ص ۲۰

۷۔ ایضاً، ص ۲۱

۸۔ ایضاً، ص ۲۱

۹۔ ایضاً، ص ۲۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۶

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۶۰

۲۲۔ ایضاً، ص ۶۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۲۶۔ انصاری، یوسف جمال (۱۹۶۴ء)، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، مشمولہ: نقوش آپ بیتی نمبر، لاہور، ص ۶۹

۲۷۔ مہر، غلام رسول، (۲۰۱۹)، نوائے سروش مکمل دیوان مع شرح، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز ص ۵۰

۲۸۔ فریدی، قمر الہدیٰ، (۲۰۱۰ء)، خودنوشت: محرکات اور فنی تقاضے، مشمولہ: نئی کتاب، شمارہ ۱۴۰، نئی دہلی، ص ۴۰

۲۹۔ ارسطو (۱۹۵۹ء)، سیاسیات از ارسطو (مترجم: سیّد نذیر نیازی)، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص ۵۰

۳۰۔ صدیقی، آفاق (۲۰۰۰ء)، محولہ بالا، ص ۴۲

۳۱۔ ایضاً، ص ۶۳

۳۲۔ ایضاً، ص ۵۲

۳۳۔ ایضاً، ص ۶۶

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۰

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۳

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۳۸۔ صدیقی (۲۰۰۰ء)، محولہ بالا، ص ۹

۳۹۔ فاروقی، شمس الرحمٰن (۲۰۱۲)، افسانے کی حمایت میں، کراچی، شہرزاد اشاعت ۴، ص ۱۲۸

۴۰۔ صدیقی، آفاق، (۲۰۰۰ء)، محولہ بالا، ص ۱۶

۴۱۔ ایضاً، ص ۵۵

۴۲۔ ایضاً، ص ۴۶

۴۳۔ ایضاً، ص ۳۱

۴۴۔ ایضاً، ص ۳۱

۴۵۔ ایضاً، ص ۸۲

۴۶۔ ایضاً، ص ۸۳

۴۷۔ ایضاً، ص ۲۵

۴۸۔ ایضاً، ص ۳۶

۴۹۔ ایضاً، ص ۵۱

۵۰۔ ایضاً، ص ۲۱

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۴۹

باب چہارم

"گئے دنوں کا سراغ" اور "صبح کرنا شام کا" تقابلی مطالعہ

فصل اول — **تقابل کیا ہے؟**

فصل دوم — **"صبح کرنا شام کا" اور "گئے دِنوں کا سُراغ" تقابلی مطالعہ**

فصل اول

تقابل کیا ہے؟

عالمی ادب میں فن پارے کی قدر شناسی اور تنقید کے لیے تقابلی مطالعے اور موازنے کی مضبوط اور مستحکم روایت موجود ہے۔ تاریخ وادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ناقدین، شعر وادب کی تفہیم، توضیح، توجیہہ اور تشریح کے لیے جہاں مختلف اقسام کے نظریات اور تناظرات سے کام لیتے رہے ہیں، وہیں انھوں نے ادباء کی قدر وقیمت اور فن پارے کے معیار اور امتیاز کے لیے موازنہ اور تقابل سے کام لیا۔ تقابلی مطالعہ صرف تنقید کے لیے ہی مختص نہیں بلکہ تخلیق میں بھی یہ زیریں لہر کی طرح فعال اور موجزن ہوتا ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ موازنہ تخلیق و تنقید کے زیر سایہ عرصہ دراز سے پرورش پاتا رہا ہے۔ تقابلی جائزہ نا صرف ادبی نمونوں کی تخلیق اور تنقید کے ساتھ جڑا نظر آتا ہے بلکہ یہ ذہنِ انسانی، فکر و نظر اور شعور کے ساتھ اس قدر شِیر وشکر نظر آتا ہے کہ ادب کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں سائنس، سماجی علوم، اقتصادیات، عمرانیات اور فلسفہ میں بھی اس کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ تقابلی مطالعے کے بغیر فِکر، خیال، جذبہ اور احساس نامکمل سے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ بات طے ہے کہ آدھی ادھوری بات تفہیم میں بھی مشکلات پیدا کرتی ہے۔ تقابلی مطالعہ ہمیشہ تخلیق اور اسلوب کے ہم رکاب نظر آتا ہے۔

تقابل کی روایت خاصی قدیم ہے۔ یہ انسانی سرشت کا جُزلاینفک ہے۔ انسانی فِکر و دانش نے ترقی کی منزل پر پہنچنے کے لیے جو نئی نئی راہیں تلاش کیں، فکر و نظر کے ان دیکھے، انجان جزیروں تک رسائی حاصل کی۔ سنگلاخ اور بلند چٹانوں پر حوصلے کی کمندیں ڈالیں:۔اس عملی، عِلمی اور فِکری کارِ دشوار میں جو چیز سب سے زیادہ اس کی معاون رہی ،وہ یہی موازنے اور تقابل کی قوت اور صلاحیت ہے۔ حیات و کائنات کے اندر حُسن و قبح کا ادراک موازنہ سے ہی ممکن ہو پایا۔ اُجالے کی بات روشنی کے ساتھ تقابل کے بغیر ناممکن ہے۔ موازنہ تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے، دو مختلف اشیاء کی ہیئت اور ساخت کے ساتھ ساتھ اِن کے اندر چُھپے جوہر کو بھی تلاش کیا جاتا ہے۔ موازنہ کے وقت ہماری نگاہ میں محاسن و مصائب دونوں کو دیکھا جاتا ہے۔ میر تقی میرؔ کا شعر اس کیفیت کی وضاحت کرتا ہے:۔

سرسری جہاں سے تُم گزرے ؎
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

"جہانِ دیگر" کی بازیافت میں موازنہ کی قوت سب سے زیادہ کار آمد ثابت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "کتے" کس نے نہیں دیکھے؟ لیکن جب یہی "کتے" "پطرس بخاری کی تحریر کا عنوان بنتے ہیں تو مختلف ہو جاتے ہیں۔

تمام شعری اور نثری اصناف میں تقابل کی کار فرمائی بھرپور انداز میں نظر آتی ہے۔ میر کی "آہ" اور سودا کی "واہ" اسی تقابلی مطالعے کی بدولت ہے۔ موازنے کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ ناقدین کے نزدیک تقابل کی دو صورتیں ہیں:

ا۔ **تقابلی ادب**

۲۔ **تقابلی مطالعہ**

ا۔ تقابلی ادب

تقابلی مطالعہ تقابلی ادب کا جُزو ہے کل، نہیں۔ تقابلی مطالعے کی روایت خاصی قدیم ہے، جبکہ تقابلی ادب عصرِ حاضر کی دین ہے۔ Comparative Literature کے بنیاد گزاروں اور ماہرین نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ادب کا مطالعہ ہی "تقابلی ادب" نہیں کہلاتا بلکہ یہ بہت سے ادبیات کو ادبی تناظر کے علاوہ دیگر علوم اور فنون کے وسیع تر تناظر میں تجزیہ بھی کرتا ہے۔

تقابلی ادب بین اللسانی اور بین التہذیبی مطالعہ ہے اور یہ مطالعہ سیاست، مذہب، سماج، تاریخ، فلسفہ، زبان و بیان، روایات اور اعتقادات پر مبنی ہوتا ہے۔ جبکہ مطالعہ عموماً ایک ہی زبان کے دو فن کاروں اور فن پاروں کا موازنہ اور مقابلہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ تقابلی مطالعہ:

تقابلی مطالعہ اور موازنہ کی تفہیم و توضیح اور طریقہ کار کے بارے میں بات کرنا نسبتاً آسان ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ تقابلی ادب اور تقابلی مطالعہ بڑی مماثلت کے باوجود اپنے دائرہ کار میں جدا جدا ہیں۔ تقابلی مطالعہ سے مراد دو یا چند فن کاروں کے فن پاروں کا تقابل ہے۔ زبانوں کی ادبی تاریخ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ فن پاروں اور تخلیقات کا باہمی موازنہ، مقابلہ اور مطالعہ ہر عہد میں موجود ہے۔ تقابلی مطالعہ کی شرح کرتے ہوئے پرویز (۱) لکھتے ہیں:-

> "تقابلی مطالعہ دو یا دو سے زیادہ فن کاروں، فن پاروں کا تجزیاتی مطالعہ ہوتا
> ہے جس سے ادب، فن پاروں اور فن کاروں کے مراتب کے تعیّن، ان کی

خصوصیات کو نمایاں کرنے اور ان کے اثرات کی نشان دہی کرنے میں قابل
لحاظ مدد ملتی ہے لیکن یہ مطالعہ تعینِ قدر سے گریز کرتا ہے۔"

اس بیان سے یہ ثابت ہوا کہ تقابلی مطالعہ دراصل ایک اندازِ نقد ہی ہے۔

تقابلی مطالعہ انتہائی کٹھن کام ہے۔ماہرین اور ناقدین اس بارے میں بھی دورائے رکھتے ہیں۔ بعض نقاد اور محقق تقابلی مطالعے کو سب سے مؤثر اور بہتر تنقیدی مطالعہ قرار دیتے ہیں جبکہ بعض اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں ,ان کے بقول مطالعے کے دوران کوئی پہلو نظر انداز ہو جائے,تو نتائج غلط ہو سکتے ہیں۔

موازنے اور تقابلی مطالعے کے بھی بالعموم وہی قواعد اور ضابطے ہیں جو تنقید کے لیے ہیں۔ ادب میں باہمی تقابل اور موازنے کی ناقص مثالیں، تنقید کے اصولوں سے انحراف اور ذاتی پسند اور ترجیحات کا غلبہ ہے۔ یہ طریقہ کار موازنے کے اصولوں سے کھلا انحراف ہے۔ گیلانی (۲) تقابلی مطالعہ کی شعریات میں لکھتی ہیں:-

"اردو میں اس کی مثال شبلی نعمانی کا "موازنہ انیس و دبیر" ہے جس میں
انیس کی برتری اور تفوق ثابت کرنے کے لیے مرزا دبیرؔ کے کمزور ترین
کلام کا انتخاب کیا گیا ہے۔"

ایک اچھے ادیب کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے ادیب کے مجموعی کلام پر رکھے۔ تقابلی مطالعہ میں غیر جانب دارانہ رویہ اپنانا چاہیے۔ناقدین کی ایک کثیر تعداد کے متعلق نوٹ کیا گیا ہے کہ وہ ادباء کی فوقیت اور فضلیت میں جلد بازی سے کام لے کر فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنا اصولوں کے منافی ہے۔ ابراہیم (۳) تقابل اور اس کے طریقہ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:-

"ایک اچھے ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے فیصلے کی بنیاد شاعر کی چند غزلیات یا
منظومات کی بجائے اس کے مجموعی کلام پر رکھے۔ بعض اوقات موازنہ نہ
کرنے والا دوسروں کی آراء پر اعتماد کر کے فیصلہ دے دیتا ہے۔ یہ بھی ٹھیک
نہیں۔ کبھی کبھی ادیب، فن کار کی شخصیت سے متاثر ہو کر رائے قائم کرنے
میں پیش دستی کرتا ہے۔ یہ بھی اصول موازنہ کے منافی ہے۔"

تقابلی مطالعے میں غیر جانب دارانہ رویہ لازمی ہے۔ جانب دارانہ تقابل سے موازنے کے فن کی رُوح مجروح ہو گئی ہے۔ تقابلی مطالعے کے طریقہ کار اور اس کی مبادیات کا ذکر کرتے ہوئے، پرویز (۴) ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:-

"تقابل مندرجہ ذیل اعتبار سے کیا جاتا ہے،

۱۔ فنی تقابل

۲۔ فکری تقابل

۳۔ موضوعاتی تقابل

۴۔ عصری تقابل"

شاہد پرویز نے جن چار باتوں کی نشاندہی کی ہے وہ اتنی جامع اور وسعت پذیری کی حامل ہیں کہ تقابلی مطالعے کے لیے ایک روشن راہ کھول دیتی ہیں۔ یہ اجزاء تقابلی مطالعے کی اساس ہیں۔ اب اس بات پر غور کرتے ہیں کہ تقابلی جائزے کا طریقہ کیا ہے؟

۱. فنی تقابل میں دو فن کاروں کی اساس اور ان کے رجحانات سے بحث کر کے امتیاز قائم کیا جاتا ہے۔
۲. موضوعاتی تقابل میں موضوعات کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔
۳. موضوعاتی تقابل میں دو الگ الگ ادوار کے فن کاروں کا ان کے عصری پس منظر میں تقابل کیا جاتا ہے جس میں سیاسی، سماجی اور معاشی حالت کو مد نظر رکھا جاتا ہے اور ان حالات کی تلاش فن پاروں میں کی جاتی ہے۔

مذکورہ عوامل کے علاوہ موازنہ یا تقابل اسلوبیاتی سطح پر بھی کیا جاتا ہے۔ موازنے اور مقابلے سے اسلوب، انداز بیان، صنعت گری، ذخیرہ الفاظ کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شعر و ادب میں تمام تر رونق، پہلوداری، معنی آفرینی، محاسن معنی و بیان بڑی حد تک اسلوب اور اندازِ بیاں کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ پرویز(۵) اس حوالے سے لکھتے ہیں:-

"اسلوبیاتی تقابل میں دو تخلیق کاروں کے اسالیب بیان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ یہ مطالعہ اس اعتبار سے دشوار تر ہے کہ ہر شخص کا اپنا فطری اسلوب ہوتا ہے اور وہ اسلوب ایک شخص کو پسند ہوتا ہے اور دوسرے کو ناپسند۔ اس لیے اسلوبیاتی تقابل معروضی نہ ہو کر موضوعاتی ہو جاتا ہے۔"

اسلوب کے لحاظ سے تقابل کے درج ذیل اصول وضع کیے جاسکتے ہیں:

۱. غیر جانب داری لازمی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ فن کار کی بجائے صرف فن توجہ کا مرکز ہو۔ یہ بھی لازم ہے کہ محقق یا فن کار کی شخصیت سے متاثر نہ ہو۔

۲. تقابلی مطالعے کا ہر گز یہ مقصد نہیں کہ ایک تخلیق کو کم تر اور دوسری کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ اصل مقصد قدر شناسی اور درجہ بندی کے علاوہ دو مختلف فن پاروں کے رنگوں اور ذائقوں سے قاری کو روشناس کر کے ان کے درمیان قُرب و بعید کو اُبھارنا ہے۔

۳. تقابلی مطالعہ اس بات کا متقاضی ہے کہ نمونے اور فن پارے کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کر کے رائے قائم کی جائے۔

۴. تقابلی مطالعہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس صنف یا عنوان کا جائزہ لے رہا ہے اس پر کلی مہارت رکھتا ہو۔ وہ صنف کے تکنیکی اور فنی پہلوؤں سے آگاہ ہو کیونکہ مختلف نثری اور شعری اصناف پر یکساں اصول نقد کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ مثنوی کے مطالعے اور تجزیے کے لیے قائم معیار اور تناظرات غزل پر لاگو نہیں کیے جاسکتے۔ یہی معاملہ دیگر اصناف کے ساتھ بھی ہے۔

۵. تقابلی جائزہ صرف مماثلت اور اشتراک کی بنیاد پر نہیں لیا جاتا، بلکی اکثر ان فن پاروں کے درمیان بھی کیا جاتا ہے جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔

۶. تقابلی مطالعہ ایک ہی زبان کے فن پاروں کا بھی کیا جاسکتا ہے اور دو زبانوں کے فن پاروں کا بھی لیکن شرط یہ ہے کہ اسے دونوں زبانوں پر محقق کو مہارت حاصل ہو۔

۷. دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے ادب کا تقابلی مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

تقابلی ادب یا تقابلی تحقیق وقت کی اہم ضرورت ہے۔ تقابل چاہے ادب کا ہو یا کسی اور شے کا، اس سے ہر صورت سود مند نتائج حاصل ہونے چاہئیں۔ تقابل سے ہی ادب کے خصائص کی قدر ہوتی ہے اور کوتاہیوں اور خامیوں کو دُور کرنے کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔ کسی بھی زبان کا ادب بذات خود کامل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ زبان کوئی بھی ہو، اس میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔ ان خامیوں کا پتہ تقابلی جائزے سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ "تقابلی مطالعہ" بے شک کار دشوار ہے لیکن یہی وہ آلہ ہے جس سے ادب کے محاسن اور معائب سامنے آتے ہیں۔ اس کے بغیر ادبی ترقی کی راہیں محدود ہو جائیں گی۔ جس طرح تنقید، ادب کو کسوٹی پر پرکھتی ہے، اسی طرح تقابلی مطالعہ بھی کسوٹی کا کام انجام دیتا ہے مگر اس کے لیے یہی شرط ہے کہ مذکرہ بالا اصول و ضوابط کو مد نظر رکھا جائے تاکہ نتائج کی حصول یابی ممکن ہو سکے۔

فصل دوم

"صبح کرنا شام کا" اور "گئے دِنوں کا سُراغ" کا تقابلی مطالعہ

تقابلی موازنے سے بیشتر چند امور کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اردو ادب میں "خود نوشت" کی ایک شان دار اور مستحکم روایت موجود ہے۔ اگرچہ اس صنف میں کم لوگوں نے قدم رکھا لیکن اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ مولانا جعفر تھانیسری سے شروع ہونے والی اس روایت کو مظفر وارثی اور آفاق صدیقی نے خوب نبھایا۔ خود نوشت تو بہت لوگوں نے لکھیں لیکن ان احباب کی آپ بیتیاں دو عشرے گزرنے کے باوجود بے التفائی کا شکار رہیں اور ناقدین ادب نے ان سے بے اعتنائی برتی۔

کسی فن پارے کا تقابلی مطالعہ کرنے کے لیے موضوعاتی تشکیل اور فنی ہنر مندی کو جانچا جاتا ہے۔ چنانچہ فن پارے کے فن کو سامنے رکھتے ہوئے غالب رجحان کی بنا پر آپ بیتیوں کی اقسام طے کی جائیں گی۔ جس میں اخلاقی، معاشرتی، اسراری، طنز و مزاح، نفسیاتی اور نظمیاتی اقسام مطالعے کے بعد ہی طے کی جا سکیں گی۔ آپ بیتی کی صنف چونکہ فرد کی پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ اس لیے اس کا کینوس بھی وسیع ہو گا۔ یہ بات ممکنات سے خارج نہیں کہ ایک خود نوشت بیک وقت کئی موضوعات کا احاطہ کر سکتی ہے۔ خود نوشت میں باقی احوال کے علاوہ اس دور کی اخلاقیات، سماجیات، سیاسیات اور مقامی ثقافت بھی زیر بحث آتی ہیں۔

آپ بیتی لکھنا بذات خود ایک نفسیاتی عمل ہے جس کے پیچھے کئی عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ نفسیات کا مطالعہ کر کے ادیب کی شخصیت کے پیچھے چھپے نہاں خانوں کو روشن کیا جا سکتا ہے۔ بقول جمال (۶) :-

> "خود نوشت لکھتے وقت آدمی کو خود نگری، خود پوشی، خود نمائی، خود جوئی و خود احتسابی اور اخذ و ترک کی بعض بڑی کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

آپ بیتی نگار اپنے باطن کی سیاحت کرتا ہے۔ کوئی دوسرا شخص کسی فرد کی باطنی اور داخلی محرکات کی درست نشان دہی نہیں کر سکتا ہے، جتنی کوئی شخص خود اپنے بارے میں کر سکتا ہے کیونکہ انسان کی دل چسپی کا سب سے بڑا مرکز خود اس کی اپنی ذات ہے۔ خود نوشت لکھنے کا مقصد اپنی زندگی سے حاصل کردہ تجربات کے متعلق دوسروں کو آگاہ کرنا، خود کسی عظیم مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد دوسروں کو بھی ایسے ہی مقاصد کے حصول کے لیے تیار کرنا، اپنے یا دوسروں کے ماحول کو بدلنے کے لیے یا دوسروں کی اصلاح کے لیے، تاریخ میں عظیم شخصیات کے کردار کو نظر انداز ہونے سے بچانے کے لیے خود نوشت لکھتا ہے۔ بعض اوقات اپنے افکار و خیالات کی تشریح و توضیح کے لیے فرد کو خود نوشت مناسب ذریعہ اظہار معلوم ہوتی ہے۔

تقابلی مطالعہ کوئی نئی چیز نہیں ہے جیسا کہ آپ بیتیوں کے سب سے بڑے ناقد پرویز پروازی خود نوشتوں کے جائزے میں کہیں کہیں کسی خود نوشت کا دوسرے خود نوشتوں کے ساتھ تقابلی جائزہ بھی پیش کرتے ہیں۔ پروازی (۷) ڈاکٹر وزیر آغا کی خود نوشت "شام کی منڈیر" کا جائزہ لیتے ہوئے دوسری خود نوشتوں کے ساتھ تقابل کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

> "شام کی منڈیر دوسری خود نوشتوں سے ممتاز ہے۔ مگر اس کی زبان جوش صاحب کی مرصع زبان نہیں، نہ شہاب صاحب کی افسانوی زبان ہے، آل احمد سُرور کا خود پرستانہ لہجہ بھی نہیں کہ سند میں اپنے ہی شعر دیتے چلے جائیں مگر اس میں کشش ضرور ہے۔ ادبی چاشنی بقدرِ نمک ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی خود نوشت ہے جس نے تنقید کو نیا لب و لہجہ، نیا آہنگ عطا کیا اور خود کسی چیز کا سہرا اپنے سر نہیں باندھا۔ یہ ایک ایسے شخص کی خود نوشت بھی ہے جسے جتنا متنازعہ بنانے کی کوشش کی گئی، اس کی شخصیت اتنی ہی اُبھر کر سامنے آئی ہے۔"

مظفر وارثی اور آفاق صدیقی بنیادی طور پر دونوں شاعر تھے۔ اُنھوں نے شعری روایت کو نہ صرف برتا، بلکہ اسے توسیع کے ساتھ استحکام بھی بخشا۔ دونوں نے غزل کی صنف کو اعتبار عطا کیا اور اس کے ساتھ نعت، منقبت، حمد اور مرثیہ جیسی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ انھوں نے مذہبی اصناف میں تاریخ، تاریخی واقعات اور تاریخی کرداروں کو اپنے اپنے انداز سے پیش کیا۔ مظفر وارثی اور آفاق صدیقی کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ تقابلی مطالعہ کا مطلب ایک کو کم تر اور دوسرے کو اس سے بہتر ثابت کرنا نہیں ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ جب بھی دو ادیبوں کی تخلیقات کا موازنہ کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد صرف تنقیص اور تحسین نہیں بلکہ قدر شناسی بھی ہوتا ہے۔ اس طریقے سے فن پارے کی ادبی قیمت متعین کی جاتی ہے کہ کونسا ادیب کس مقام پر ہے اور اس کی تخلیق ادب میں کس طرح اضافے کا باعث ہے۔ موازنے کا طے شدہ کلیہ یہ ہے کہ فن پاروں کے درمیان جو مماثلات، اشتراکات اور افتراقات ہیں، ان کی نشان دہی کی جائے یعنی محاسن اور معائب کی بنا پر قدر متعین کی جائے۔ اس مقالے کے باب دوم اور سوم میں بھرپور طریقے سے مظفر وارثی اور آفاق صدیقی کی خود نوشتوں بالترتیب "گئے دِنوں کا سُراغ" اور "صبح کرنا شام کا" کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی جائزے اور مطالعے کی بنیاد پر اب ان کا تقابلی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

آپ بیتیوں پر تحقیقی کام کے بیشتر حوالے اور مقالے منظر عام پر آنے کے باوجود "صبح کرنا شام کا" اور "گئے دِنوں کا سُراغ" خود نوشتیں خصوصی توجہ سے محروم رہیں۔ ایک بات تو طے ہے کہ دونوں ادیبوں کو فن پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ دونوں کی تحسین ہر طبقہ فکر کے لوگوں نے کی ہے جیسا کہ نبیل (۸) اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> "مظفر وارثی آسمانِ نعت کا ایک ایسا روشن ستارہ ہیں۔ مظفر وارثی نے اپنی نعتوں میں سیرت کے انقلابی پہلوؤں کو کثرت سے پیش کیا ہے۔"

آفاق صدیقی کے بارے میں گوشہ ادب اخبارِ جہاں میں ملک (۹) لکھتے ہیں:

> "آفاق صدیقی سندھ کی اردو اور سندھی بولنے والی آبادیوں کے درمیان پُل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے علمی و ادبی سطح پر سندھ کی لازوال خدمات انجام دی ہیں۔"

مماثلات:

- سب سے اہم مماثلت دونوں آپ بیتیوں کا سن اشاعت ہے۔ مظفر وارثی کی آپ بیتی کا سن اشاعت مارچ ۲۰۰۰ء ہے اور آفاق احمد صدیقی کی آپ بیتی کا سن اشاعت جولائی ۲۰۰۰ء۔ اس طرح سے دونوں آپ بیتیوں کا سن اشاعت ایک ہی ہے۔ دونوں آپ بیتیوں میں خاندانی حالات، ہجرت، مشاعروں، ادبی زندگی، سیاسی حالات اور دیگر سرگرمیوں کا ذکر ملتا ہے۔
- عہد اور معاشرہ کوئی بھی ہو، فرد اپنے گرد و نواح سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ ہمارے رویے ہماری ذہنی احساسات اور اخلاقیات کے عکاس ہوتے ہیں۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ ہم اپنے ارد گرد کے ماحول سے اخذ و ماخوذ کرتے ہیں۔ مظفر وارثی اور آفاق صدیقی الگ الگ ماحول کے پروردہ تھے مگر خیالات کی ہم آہنگی نے اِن کو کئی طرح سے ایک دوسرے کے مماثل بنا دیا۔ زندگی جینے کا جو تجربہ ان دو ادیب حضرات نے برتا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاصا گہرا تجربہ ہے۔
- مشترکہ عناصر کا اگر جائزہ لیا جائے تو دونوں ادیب حضرات مشترکہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان سے پہلے دونوں خاندان ضلع اتر پردیش میں دو مختلف مقامات پر رہ رہے تھے۔ مظفر وارثی کا خاندان میرٹھ اور آفاق صدیقی کا خاندان فرخ آباد میں قیام پزیر تھا۔ دونوں کے خاندان مالی طور پر خوشحال تھے اور زندگی کی ہر طرح کی سہولیات سے لطف اندوز ہو رہے تھے، جس کی وجہ ان کی تربیت بھی اچھے ماحول میں ہوئی اور ان دونوں میں زندگی کو سلیقے سے جینے کے افکار موجود تھے۔

- آفاق صدیقی اور مظفر وارثی دونوں کے گھروں کا ماحول ادبی تھا اور مشاعروں کی روایت سے جُڑا ہوا تھا۔ مظفر وارثی کے والد صاحب کی اپنی لائبریری تھی۔ وہ ہر وقت مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے شرف الدین کتابوں کی ایک بڑی دکان چلا رہے تھے۔ مظفر وارثی کو مطالعہ کا شوق وارثت سے ملا تھا۔ گھر کے ادبی ماحول نے ان کے ذہن کی بچپن سے ہی راہ راست کی طرف آبیاری کی۔ آفاق صدیقی صاحب کے والد ملازم تھے اور ان کے گھر جگر مراد آبادی کا آنا جانا تھا۔ اکثر آفاق صدیقی صاحب کی جگر صاحب سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ اس طرح آفاق احمد صدیقی کو بھی ادب سے آہستہ آہستہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ گھر کے ماحول نے دونوں کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا اور دونوں کے ادبی دنیا میں اپنا ایک نام اور مقام حاصل کیا۔
- دونوں صاحب زبان تھے۔ دونوں کو ادب سے لگاؤ تھا اور اپنی زندگی کے آخری ایام تک پڑھنے اور لکھنے کے کام میں مشغول رہے۔ دونوں نے بے شمار ادبی کتب تخلیق کیں اور دونوں کا مطالعہ وسیع تھا۔ جب بھی وقت ملتا کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے۔ دونوں نے بے شمار ادبی تخلیقات چھوڑی ہیں۔
- دونوں ادیب صدیقی تھے اور ان کا سلسلہ نصب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا تھا۔ شجرہ نسب ایک ہونا بھی بہت سی عادات و خصوصیات کے اشتراک کی وجہ بنتا ہے۔ یہ حقیقت اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں کی رگوں میں نسلی خون موجود تھا۔ دونوں میں کوئی بھی ایسی عادت نہ تھی جو ان کے خاندان اور ان کی ذات کے لیے رسوائی کا باعث بنتی۔ دونوں نے اپنی ساری زندگی انسانیت کی بھلائی اور فلاح انسانیت کی راہ میں بسر کی۔ انھوں نے بے شمار فلاح کام کر کے خود کو زندہ جاوید کیا ہے۔ دونوں نے زندگی بھر سچائی اور حق گوئی کا ساتھ دیا۔ اگرچہ دونوں کی زندگی میں بے شمار مالی مسائل بھی تھے مگر پھر بھی انھوں نے حلال کمانے کو ترجیح دی۔
- دونوں غزل کے شاعر تھے اور ان کا غزلیہ کلام مجموعوں کی شکل میں شائع ہوا۔ شاعری میں غزل کے ساتھ ساتھ دونوں نے نے نعت گوئی میں طبع آزمائی کی۔ آفاق احمد صدیقی سندھ میں اور مظفر احمد وارثی پنجاب میں نعت کے میدان میں مشہور تھے۔ دونوں کی نعت کی طرف رغبت بھی ان کے ایک مشترکہ پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جب دل عشق رسول ﷺ سے موجزن ہوتا ہے تو ہی انسان شعر کہتا ہے۔ انھوں نے بہت سے نعتیہ مجموعے لکھے ہیں۔ اگرچہ آفاق صدیقی سے زیادہ نعتیہ مجموعے مظفر وارثی کے ہیں مگر دونوں نے اس صنف میں شہرت پائی ہے۔ عمدہ نعتیں لکھی ہیں۔ ان میں اکثر تو لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔ جذبات اور خیالات کی روانی ان کے نعتیہ کلام کی نمایاں خوبی ہے۔ دونوں کے نعتیہ کلام میں عشق اور عقیدت کی گہری لگن محسوس ہوتی ہے۔
- دونوں زُود گو تھے۔ دونوں نعت ہو یا غزل پڑھنے کا فن جانتے تھے۔ ان کے مداحوں کی تعداد بھی خاصی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں کو اپنے فن میں مہارت تھی۔ سامعین کو مداح کرنے پر بندہ قائل تب ہی کر سکتا

ہے جب وہ اپنے فن میں کاریگر اور ماہر ہو۔ اگرچہ دونوں نے شاعری کی دیگر اصناف میں بھی شاعری کی مگر نعتیہ کلام ان کی شہرت کی وجہ ٹھہرا۔

- مظفر وارثی اور آفاق صدیقی دونوں نے تقسیم کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ہجرت کے وقت کس طرح عوام نے اپنی جان کو قربان کیا۔ کس طرح عورتوں کی عزتوں سے کھیلا گیا۔ کس طرح مسلمان بے یار و مدد گار پاکستان پہنچے۔ کس طرح مہاجرین نے اپنے پیاروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھا۔مال و اسباب کس طرح لوٹا گیا۔ ہجرت کے بعد پاکستان کے مقامی باشندوں نے مہاجرین کے ساتھ کس طرح لوٹ مار کی۔ دونوں کی زندگی کا زیادہ تر حصہ پریشانیوں اور نوکری کی تلاش میں گزرا۔ مالی مشکلات نے زندگی میں بے شمار سبق سیکھائے۔ دونوں کو ہجرت کے وقت ہونے والے قتل وغارت جیسے واقعات کا بہت دکھ تھا۔
- اگر آفاق صدیقی اور مظفر وارثی کی ازواجی زندگی کی بات کی جائے تو دونوں کی ازواجی زندگی بہت خوشگوار تھی۔ دونوں اپنے والدین اور عزیزو اقارب کے تعاون سے رشتہ ازواج سے منسلک ہوئے۔ اگرچہ آفاق صدیقی کی نسبت قیام پاکستان سے پہلے انڈیا میں اپنے خاندان میں طے ہو چکی تھی مگر تقسیم ہندوستان کی وجہ سے یہ نسبت ٹوٹ گئی اور آپ نے شادی اپنے دوستوں کے کہنے پر ایک شریف خاندان میں کی اور بالکل اسی طرح مظفر وارثی نے بھی اپنی والدہ کے کہنے پر ہی شادی کی تھی۔ دونوں نے اپنی ازواجی زندگی کامیاب گزاردی۔ نہ بیویوں کو ان سے کبھی شکایت تھی اور نہ ہی کبھی انہوں نے انہیں کبھی شکایت کا موقع دیا۔ اگرچہ دونوں نے اپنی زندگی کے دن تنگی میں گزارے مگر پھر بھی ان کی بیویاں بہت کیفیت اشعار اور عاجز تھیں۔ دونوں صاحب اولاد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو اولاد جیسی نعمت سے نوازا تھا۔ مظفر وارثی کی بیوی کا نام ہاشمی بیگم تھا جن سے تین بیٹیاں، افشاں سمیں، صائمہ زریں اور عدیلہ آفرین اور ایک بیٹا، حسیب وارثی تھا اور آفاق احمد صدیقی کی پہلی بیوی کا نام ناظمہ بیگم تھا جس سے ایک بیٹی ناہید بیگم اور ایک بیٹا، شاہد احمد صدیقی تھا۔ آفاق احمد صدیقی نے زندگی کی آخری حصے میں دوسری شادی قیصر جہاں ہاشمی سے کی۔ اگرچہ دونوں نے ملازمت کرکے اپنی زندگی بسر کی مگر انہوں نے کبھی بھی حرام کمائی کا نہ سوچا تھا۔ چاہتے تو بہت کچھ کما سکتے تھے مگر دونوں نے اپنے زندگی میں خود بھی حلال کمایا اور اپنی اولاد کو بھی حلال کھلایا۔ دونوں کی پوری زندگی امن و سکون سے گزری، اگرچہ مالی مسائل تو تھے مگر گھریلوں مسائل ایسے نہ تھے جن پر ان کو ندامت ہوتی اور ذہنی سکون ختم ہو جاتا۔ دونوں کو اپنے والدین کی عزت کا خیال تھا اور کبھی بھی کوئی ایسا کام نہ کیا جو پورے خاندان کے لیے رسوائی کا باعث بنتا۔ اپنے والدین کے فرمابردار تھے۔ خاندانی وقار کو ہر صورت قائم رکھتے تھے، چاہے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ اپنی ساری زندگی محنت کرتے ہوئے بسر کی اور کبھی دوسروں سے توقعات وابستہ نہ کیں تھیں۔ دونوں نے زندگی مذہبی طریقے

سے گزاری۔ نمار اور روزے کے پابند تھے۔ دینی معاملات میں کبھی غفلت سے کام نہ لیتے تھے۔ دونوں میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو کہ ایک اچھے انسان میں ہونی چاہیے۔

- دونوں آپ بیتیوں کے نام پر غزلیہ اشعار کے مصرعے ہیں۔ مظفر وارثی کی آپ بیتی کا نام "گئے دِنوں کا سُراغ" ناصر کاظمی کے شعر سے لیا گیاہے۔ شعر یہ تھا:-

گئے دِنوں کا سُراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

سے لیا گیا۔ جبکہ آفاق صدیقی کی خود نوشت "صبح کرنا شام کا" مرزا اسد اللہ خان غالب کی غزل کے شعر سے لیا گیا ہے۔ شعر کچھ اس طرح سے ہے:-

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

- دونوں ادیب حضرات نے شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھی اور خود نوشتیں بھی تحریر کیں۔اگرچہ آفاق کی نثری تصنیفات کی تعداد مظفر وارثی سے زیادہ ہے۔ مظفر وارثی نے نثر میں صرف آپ بیتی ہی لکھی ہے جبکہ آفاق صدیقی نے بہت سے نثری کتب اردو اور سندھی میں تخلیق کیں ہیں۔ دونوں نے اپنی آپ بیتوں میں بہت سے سیاسی اور ادبی واقعات کا اظہار بیان کیے گئے ہیں۔ قاری ان کے دور میں ہونے والی ادبی اور سیاسی تبدیلیوں سے کافی واقفیت حاصل کرتا ہے۔ ہر ادب اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح یہ دونوں آپ بیتیاں بھی اپنے عہد کی عمدہ عکاسی کرتے ہے۔ دونوں کے ہاں عصری شعور نمایاں ہے۔وہ اپنی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ گردوپیش سے بھی بے خبر نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں فطرتاً حساس ہیں اور درد دل رکھتے ہیں۔
- دونوں ادیب حضرات ہم عصر تھے۔ دونوں کے اپنے روزگار کے متعلق مسائل کا ذکر کیا ہے۔ مظفر وارثی کی تعلیم ایف اے اور ادیب فاضل تھی اور آفاق احمد صدیقی نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ مظفر وارثی اسٹیٹ بنک لاہور میں ملازم ہو گئے اور آفاق احمد صدیقی نے سکھر کے ایک سکول سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ مصنفین نے اپنی تخلیقات میں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ آفاق صدیقی بیسویں صدی کے تیسری دہائی کے آخر میں اور مظفر وارثی بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آغاز میں پیدا ہوئے۔ یوں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ دونوں کا ایک ہی عہد بنتا ہے۔ دونوں نے اس دور کے بہت سے مسائل کو بیان کیا ہے جن میں ہجرت کے مسائل، آبادی کاری کے مسائل اور روزگار کے مسائل شامل ہیں۔

- دونوں ادیبوں کی آپ بیتیوں میں اپنے دور کی سیاست کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ مظفر وارثی نے نواز شریف، بے نظیر اور ضیاء الحق سے اپنے تعلقات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ طاہر القادری کی پاکستان عوامی تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ طاہر القادری مصطفوی انقلاب لانا چاہتے تھے۔ بالکل اسی طرح آفاق احمد صدیقی نے بھی اپنی آپ بیتی میں ایوب خان اور بھٹو کے بارے میں لکھا ہے کہ ایوب احمد خان کو پاکستان کا صدر منتخب کیا گیا اور ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا۔ اس طرح ہم دونوں کی آپ بیتیوں میں اس دور کے سیاسی حالات کے بارے میں آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ ادب اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ یہ آپ بیتیاں اپنے دور کی سچی تصویریں پیش کرتی ہیں۔
- "گئے دِنوں کا سُراغ" اور "صبح کرنا شام کا" سماجی موضوعات سے مملو ہیں۔ سماجی معاملات میں ہر وہ معاملہ زیرِ بحث آسکتا ہے جو انسانی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ غُربت، مفلسی، تعلیم، رسوم ورواج، اقربا پروری، طوائف، حصولِ انصاف، لاقانونیت، لسانی اختلافات، شادی، مذہب، خود نمائی اور ضعیف الاعتقادی وغیرہ۔

افراد کی کوشش سے ایک الگ معاشرہ ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ کوئی بھی سماج رشتوں کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ رشتے بنیادی اور ثانوی دونوں نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ سماج اپنی پہچان اِنھی ادبی، معاشی، سیاسی رشتوں کے مابین نظم وضبط، ہم آہنگی اور ہمدردی سے کرتا ہے۔ تہذیب و ثقافت کا کردار بھی سماج کے لیے ناگزیر ہے۔ سماج کی طرح تہذیب و ثقافت کا مرکز و محور بھی فرد ہی ہے۔ مختلف افراد کی دل چسپیاں، ان کے رویے اور اقدار کسی تمدن اور تہذیب کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ رویے منفی اور مثبت دونوں اقسام کے ہو سکتے ہیں۔ ایک عمدہ تہذیب و ثقافت ہی کسی سماج کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر سکتی ہے۔

مظفر وارثی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں کی سماجیات اور معاشرت کو کافی تفصیل سے بیان کیا ہے اُنھوں نے اپنی خود نوشت میں مختلف تہواروں، رسوم اور مشاعروں کا تذکرہ کیا ہے۔ وارثی (۱۰) لکھتے ہیں:۔

> "آج جہاں کوئی حکمران جاتا ہے دُور دُور تک پرندہ پَر نہیں مار سکتا لیکن اس زمانے کے آداب یہ نہ تھے۔ شدید موسم گرما میں شاہی مسجد میں ٹاٹ کی ایک پوش سے ملک کے وزیر اعظم خان لیاقت علی داخل ہو رہے تھے اور دوسری سے ابا میاں جی باہر نکل رہے تھے۔"

غربت اور مفلسی سے انسانوں کو کیا دن دکھاتے ہیں۔ وارثی (۱۱) بتاتے ہیں کہ جو مکان ہم چھوڑ کر پاکستان آرہے تھے وہ جبار بلڈنگ میں تین روپے ماہانہ کرائے کا ایک کوارٹر تھا۔ جبار ابا میاں سے کرایہ نہیں لیتے کہ ان کے چالیس پینتالیس کوارٹرز بھی ہمارے داد جان کی دین تھے۔ جبار کندھے پر دال کپڑا بیچنے والا پارچہ فروش تھا جب تمام مکانوں اور سامان سے ابا میاں جی فارغ ہو گئے تو حویلی جبار کے پاس گروی رکھ دی۔ آہستہ آہستہ گروی کی رقم بڑھتی رہی اور مختلف ہندسوں سے ضرب دی جاتی رہی۔ جب حاصلِ ضرب کچھ نہ بچا تو حویلی اس کے سُپرد کر کے کرائے کے مکان میں چلے گئے۔

غربت اور مفلسی کے دِنوں کو آفاق صدیقی کس طرح یاد کرتے ہیں وہ اپنے والد کا احوال آپ بیتی "صبح کرنا شام کا" میں (۱۲) کس طرح بیان کرتے ہیں:-

> "ناداری نے ان کو چُپ چاپ سے کر دیا تھا۔ وہ بہت ایثار پسند، بے انتہا پُر خلوص اور سب سے پیار کرنے والے درد مند انسان تھے۔ جب تک خوش حالی کا دَور رہا۔ حاتم طائی بنے رہے اور جب تنگ دَستی سے سابقہ پڑا تو گھر کی قیمتی چیزوں کو اونے پونے بیچ کر یا پھر قرض لے کر بھی بال بچوں اور عزیز و اقارب کی ضرورتیں پوری کیں۔"

دونوں مصنفین نے اپنی سرگزشتِ حیات میں بر صغیر کی تقسیم کے دوران فسادات، ہجرت اور قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات کو اختصار سے قلم بند کیا ہے۔ آزاد اور خود مختار وطن حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو اپنے پیاروں کی جو قربانیاں دینا پڑی، جِن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ہجرت کے دوران جو خون کی ہولی کھیلی گئی دونوں نے اس صورتِ حال کا ذکر کیا ہے۔ تقسیمِ ہند کے دوران قتل و غارت گری کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے وارثی کہتے ہیں:

- کانوائے سہارن پور پہنچا تو وہاں لاشیں بکھری پڑی تھیں۔(ص ۵۴)
- ٹرین چلی تو اندیشے، امیدیں، آرزوئیں، مایوسیاں، اندھیرے اور حوصلے ساتھ چلتے۔ گاڑی چلتی کم رُکتی زیادہ، رُکتی تو سانس بھی رُکنے لگتی۔ (ص ۵۴)
- دوسرے دن کے سورج کی طرح نبضیں بھی ڈوب رہی تھیں۔ کئی گھنٹے رُوح فرسا انتظار کے بعد پاکستانی فوج اور انجن آیا اور پہیے چلے اُدھر گولیاں۔(ص ۵۵)

- حضرت میں نے سر چھپانے کے لیے چھت مانگی تھی حرام کا مال نہیں، کچھ دن بعد اے آر او صاحب کا آدمی دوبارہ آیا اور رام گلی میں چھوٹا سا تین منزلہ خالی خولی مکان ہمیں الاٹ کر دیا گیا۔ (ص ۵۷)

اسی حوالے سے آفاق صدیقی کی خود نوشت سے واقعات ملاحظہ کیجیے:

- شہر شہر، بستی بستی اور گاؤں گاؤں ہندو مسلم کشیدگی سر اٹھانے لگی۔ اخبارات میں فسادات، قتل و غارت گری اور خون خرابے کی الم ناک خبریں پڑھ کر دل ہولنے لگے۔ (ص ۳۲)
- ملک کی سیاسی فضاؤں میں تناؤ کی شدت بڑھتی گئی۔ ہندو مسلم فسادات کے شعلے تیزی سے بھڑکنے لگے۔ (ص ۳۳)
- اس عارضی پناہ گاہ میں طرح طرح کے دردناک مناظر دیکھے جو اب بھی یاد آجاتے ہیں تو سوچنے لگتا ہوں کہ انسان کتنا ظالم ہے جو ظلم ڈھاتا ہے تو درندوں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ (ص ۳۴)
- آرام باغ کے علاقے میں ایک پینٹر کی دکان پر چھے سات گھنٹے کام کیا تو تین روپے مزدوری ملی اگلے دن ایک ڈاک خانے کے سامنے بوریا جما لیا۔ کسی کا خط اور کسی کا منی آرڈر لکھا۔ جیب میں چھے سات روپے آگئے تو رات کو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ (۳۷)
- شہر میں کنبے والے افراد تو اچھے اچھے مکان الاٹ کرا رہے تھے یا پھر ساز و سامان سے بھرے ہوئے مکانوں کے تالے توڑ کر قبضہ جماتے لیکن مجھ جیسے تنہا افراد تو کٹی پتنگ کی طرح بقول جمیل خیمے اُٹھائے پھرتے ہیں۔ ہر دم ہوا کے ساتھ (ہجرت کے بیان میں بعض جگہ دونوں کے بیانات بالکل ملتے جلتے کہتے ہیں۔ مثلاً آزادی کے بعد نئی مملکت میں آنے والوں کے رویوں کے بارے میں دونوں کی تحریر میں یہ بات ملتی ہے کہ لوگ تالے توڑ کر گھروں پر قبضے کر رہے تھے)۔ (ص ۴۴)

ہر شخص کے اپنے اپنے مذہبی اعتقادات اور مسالک ہوتے ہیں۔ اُنھی کے مطابق وہ اپنی زندگی گزارتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو مظفر وارثی اپنے وارثی فرقے کے متعلق لمبی چوڑی تفصیل سے بتاتے ہیں۔ وارثی (۱۳) رقم طراز ہیں:-

> "داداجان شیخ محمد علاؤالدین احمد صدیقی شہر کے چند رئیسوں میں سے ایک تھے۔ میرٹھ سے نو دس کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں علی پور تھا اجداد کا تعلق وہیں سے تھا۔ علی پور میں واقع نوگزہ پیر کی قبر ہمارے ہی کسی بزرگ کی تھی۔"

اپنے والد علامہ صوفی وارثی میرٹھی کے بارے میں بتاتے ہیں کہ والد صاحب کو میرے داد "پوتڑوں کا رئیس" کہتے تھے۔ مختلف اتالیق گھر پڑھانے آتے تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور قرآن وحدیث کے الگ اتالیق تھے۔ ایک واقعہ درج کرتے ہیں کہ ایک دن شاگرد نے استاد سے پوچھا کہ سید صاحب! سُنا ہے سیدوں پر دوزخ کی آگ حرام ہو گی۔ تم نے صحیح سُنا ہے بیٹا۔ سید بولے تو پھر یہ انگارے آپ کو کیا جلائیں گے؟ داداجان کی دہکتی چِلم کی طرف انھوں نے اشارہ کر کے کہا۔ سید صاحب نے چشمِ زدن میں چِلم کے سارے انگارے اپنی ہتھیلی پر اُلٹ کر دوسری ہتھیلی سے اُنھیں ڈھانپ لیا اور تھوڑی دیر بعد ٹھنڈے کوئلے زمین پر پھینک دیے۔ ان کی دونوں ہتھیلیوں پر جلے کا کوئی نشان نہ تھا۔ داداجان نے سرزنش کی تو سید صاحب نے کہا کہ شیخ صاحب! بچے کو کچھ نہ کہیے یہ سوال معمولی نہ تھا نہ جواب۔ یہ بچہ اپنے بزرگوں کو صحیح جانشین ثابت ہو گا۔

وارثی (۱۴) لکھتے ہیں:-

"چاروں سلسلوں سے بیعت ہونے کے باوجود ابا میاں جی بزرگان دین کی تلاش میں رہتے اجمیر شریف، کلیر شریف، دلی اور دوسرے مقامات پر وہ اور اکبر وارثی تمام عمر عرسوں میں شرکت کرتے"

مظفر وارثی بتاتے ہیں کہ کسی شہر سے اطلاع ملی کہ کوئی بڑے بزرگ آرہے ہیں۔ یہ دونوں (اکبر وارثی اور صوفی وارثی) نیاز حاصل کرنے جا پہنچے۔ قیام گاہ کی درزوں سے جھانکا تو دو بوڑھی عورتیں اُن بزرگ کی کمر دبا رہی تھیں باہر ہی سے لوٹ آئے۔ کچھ عرصہ بعد کسی اور جگہ کسی بزرگ سے ملاقات کو گئے تو ایک دم سے اوسی بزرگ سے سامنا ہو گیا۔ بولے "ہمارے پاس کیا لینے آئے ہو؟ ہم تو عورتوں سے جسم دبواتے ہیں۔ " ابا میاں اِن کے قدموں میں گر گئے بقول اِن کے "پیار سے کمر میں ایسا مُکا مارا جس نے مکہ پہنچا دیا۔ وہ اور اکبر وارثی دونوں حاجی وارث علی شاہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے یہ بنیادی طور پر سلسلہ چشتیہ سے تھے لیکن اُن سے جو نام چلا، نام کی مناسبت سے وارثی کہلائے۔ وارثی (۱۵) کہتے ہیں:-

"علامہ صوفی وارثی میرٹھی پشتینی ولایت کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی شخصیت کی کئی پرتیں تھیں۔ درویش بھی، شاعر بھی اور شعلہ نوا خطیب بھی، ہومیوپیتھ ڈاکٹر بھی اور شطرنج کے منجھے ہوئے کھلاڑی بھی، محفلِ نعت کی رونق بھی اور جنگِ خلافت کے سیاسی رہنما بھی، غرض اِن کی ذات آئینہ نہیں، آئینہ خانہ تھی۔ وارثی سلسلے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں شاعر بہت ہوئے"

محمد آفاق صدیقی نے بھی اپنی خودنوشت "صبح کرنا شام کا" میں مذہبی شیفتگی اور خوش عقیدگی کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے گاؤں شیخ پور میں موجود درگاہ، گدی نشینوں اور عقیدت مندوں کے متعلق لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے نانی اماں سے پوچھا کہ "یہ جو اپنا گاؤں ہے اسے شیخ پور کیوں کہتے ہیں؟" نانی اماں نے میرے سوال کے جواب میں پوری کہانی سنانے کی ٹھان لی۔ وہ نانی اماں کی زبانی بتاتے ہیں کہ شیخ محمود درویشِ کامل کی تلاش میں نکلے اور ملتان شاہ رکنِ عالم کی خدمت میں حاضر دی۔ اُنھوں نے اچھی طرح آزمانے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں بھیجا۔ طلب سچی تھی۔ کافی عرصہ مرشد سے فیض حاصل کیا اور اُن کے حکم پر حضرت شیخ مخدوم محمود شیخ براق لنگر جہاں نے گنگا ندی کی ترائی کے علاقے بھوج پور کے جنگل کو شیخ پور بنا دیا۔ اپنے بارے میں آفاق صدیقی بتاتے ہیں کہ میری پیدائش کے بعد میری والدہ اس قابل نہ تھیں کہ میری پرورش کر سکتیں۔ مجھے محمود میاں کی بیگم نے گود لے لیا اور سینے سے لگا کر میری پرورش کی۔ محمود دادا بھی مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ وہ ہمارے ابا کے پیرو مرشد ہی نہیں قریبی رشتے سے ماموں بھی تھے۔

عقائد اور مذہب معاشرے میں امن و امان کے داعی ہوتے ہیں۔ دورِ جدید میں جبکہ انسان ترقی کے بامِ عروج پر ہے معاشرے میں اب بھی پیری، مریدی، عقیدت مندی فرسودہ روایات کا چلن موجود ہے۔ دونوں مصنفین کا تعلق ہندوستانی تہذیب سے تھا، اس لیے اُن کی خودنوشتوں میں جا بجا میل میلاپ اور باہمی الفت اور انسبت کے مطالبے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جِس ماحول میں آنکھ کھولی وہ وہاں کی تہذیب، تمدن اور رہن سہن کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کرتے ہیں۔ معاشرے میں باہم ملاپ سے طمانیت کا احساس باقی رہتا ہے۔ مل جُل کر رہنے کے حوالے سے اُنھوں نے تہذیبی عناصر کو بیان کیا ہے۔ لوگوں کا تصوف کی طرف گہرا رجحان تھا اور لوگ مشہور بزرگانِ دین کی درگاہوں پر حاضری دینے جایا کرتے تھے۔ خاص مواقع اور محرم میں نذر و نیاز کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ مظفر وارثی نے اپنے والد اور والدہ اور آفاق صدیقی نے درگاہِ احسنی کے محمود دادا اور اپنے والد کا ذکر زیادہ کیا ہے۔

ان کی تخلیقی جہات مختلف اصناف پر مشتمل ہیں۔ لیکن شاعری اور سوانح نگاری دونوں میں مشترک ہے۔ دونوں نے ابتداء میں شاعری کو اپنی تخلیقِ اظہار کا وسیلہ بنایا۔ مختلف شہروں سے تعلق رکھنے کے باوجود درخشندہ شخصیات نے ادب کے فکری اور فنی دامن کو وسیع کیا اور دونوں کو ان کی شعر و ادب کی خدمات کے صلے میں صدارتی ایوارڈ دیا گیا۔

متفرقات:

اگرچہ مظفر وارثی اور آفاق احمد صدیقی کی خود نوشتوں میں بہت سے مشترک پہلو شامل ہیں مگر پھر بھی دونوں آپ بیتیوں میں بہت سے متفرقات بھی شامل ہیں۔

- اس سلسلے میں سب سے پہلے سیاست آتی ہے۔ ادب اور سیاست کا باہمی ربط ہے۔ سیاست ایک علم اور فن ہونے کے ساتھ ساتھ فرد کے لیے ایک ذہنی تحریک بھی ہے۔ محققین اور ناقدین کا خیال ہے کہ ادب میں سیاست کا عمل دخل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ادب تلقین کی بجائے ترجمانی کا کام کرتا ہے۔ سیاست نظریہ ہے اور نظریے کے لیے نعرے بازی کی ضرورت ہے جبکہ ادب نعرہ بازی کا نام نہیں ہے۔ سوانح نگاری، مکتوب نگاری، خودنوشت، رپورتاژ، سفر نامہ جیسی اصناف اپنے دور کے رجحانات اور خیالات کی آئینہ دار ہوتی ہیں لیکن اس کے لیے سلیقہ طریقہ ہونا شرط ہے کہ یہ اظہار کچھ ادبی تقاضوں کے تابع ہوتا ہے۔ بغیر کسی قاعدے کے سیاسی نظریات کا پرچار فکشن کے حُسن کو داغ دار کر دیتا ہے۔ سیاست کے تصورات کو ادب میں پیش کرنے کے کچھ اصول وضوابط وضع کیے گئے ہیں جن پر عمل کرنا ادیب کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ادب میں سیاست کے تصورات اور نظریات کے اظہار میں ایک بحث مدافعتی اور مزاحمتی نوعیت کی بھی ہے۔ "مدافعت اور مزاحمت" ادیب کے ریاست سے وفاداری کے مسائل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اردو ادب کے آپ بیتی نگاروں نے کہیں نہ کہیں اپنی ذات کے اظہار میں اداروں اور ریاست کی سیاست کا تذکرہ کیا ہے۔ مظفر واثی کو بھی سیاست سے لگاؤ تھا۔ سیاست کے بارے میں دونوں ادیبوں کے خیالات مختلف تھے۔ پہلے ہم مظفر وارثی صاحب کے خیالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ وارثی(۱۶) لکھتے ہیں:

> "ہم نے ضیاء صاحب سے گزارش کی جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟
> ضیاء صاحب نے حسبِ دستور مسکرا کر اجازت رحمت فرمائی۔ ضیاء صاحب!
> اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اقتدار کے ساڑھے گیارہ سال عطا
> کیے۔ اُنھوں نے آدھی دنیا فتح کر لی تھی۔ آپ کی حکومت کو دسواں سال
> جاری رہاہے لیکن اسلام کا دور دور تک پتہ نہیں۔"

مظفر وارثی صاحب کو ضیاء الحق نے مختصر سا جواب دیا جِس سے وہ مطمئن نہ ہوئے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ضیاء جیسا مردِ مجاہد بھی کسی طاقت کے سامنے مجبور ہو جائے تو نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ خود تو کرسی پر آکر بیٹھنے سے رہا۔ اسی طرح میاں نواز شریف کے حوالے سے وارثی(۱۷) رقم طراز ہیں:

"ہم نے سارے قرض اُتار دیے میاں صاحب کی محبت کا قرض چڑھالیا۔
مصطفوی انقلاب کے لالچ میں ہم طاہر القادری صاحب کی طرف کیا
گئے، میاں برادران ہم سے سخت متنفر ہو گئے۔"

بے نظیر کے دَور کے بارے میں مظفر وارثی کا خیال ہے کہ اُن کا پہلا دَور ہو یا دوسرا، انتقام سرِ فہرست رہا۔ بقول اُن کے بے نظیر نے اِن کے ایوارڈ کو رُکوا دیا۔ وارثی (۱۸) ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے مذہبی شعبے کے انچارج مولوی ہدایت اللہ میرے پاس آئے اور فرمایا "آپ پیپلز پارٹی سے دُور کیوں رہتے ہیں؟ ہم نے کہا جتنی وہ خدا اور رسول ﷺ سے دور رہتی ہے، اتنا ہی دُور ہم اس سے رہتے ہیں۔ پی پی والے کسی مرد کو اپنا لیڈر بنائیں اور وہ مردِ خدا ہو تو ہم اپنا رویہ بھی بدل سکتے ہیں۔" سیاست کے حوالے سے مظفر وارثی کی خود نوشت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے جس سے اُن کے سیاسی شعور اور سیاست میں دل چسپی کا پتہ چلتا ہے۔ مظفر وارثی آئیڈیلزم کا شکار تھے۔ مظفر وارثی کی خود نوشت میں ادبی سیاست کا بھی کافی زیادہ تذکرہ ہے جِس کے لیے چند جُملے ملاحظہ کیجیے:

- تصوف کی گدی پر نہ بیٹھے فنونیت کا سنگھاسن سنبھال لیا۔ (ص۹۸)
- ملازمت ملنے کے بعد خالد احمد نے پیٹ سے سوچنا چھوڑ دیا۔ (ص۹۸)
- قتیل دوست بنانے کا فن خوب جانتے ہیں اور دوستی کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کے تو ماسٹر ہیں۔ (ص۱۱۴)
- "میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا" ہر مشاعرے میں سُنایا کرتا تھا۔ (ص۱۲۸)
- جالب اور فراز کی طرح میر بھی سامعین سے طلوع ہوتے ہیں۔ (ص۱۳۱)
- یہ بات تو مسلمہ تھی کہ شہزادے نے سجدہ سہو کر لیا تھا۔ (ص۱۳۴)
- تکیے کے نیچے چھپائی ہوئی کتاب نکال کر ہم ورق گردانی کرنے لگے سیف کا رنگ اُڑ رہا تھا ہمارے حواس۔ (۱۳۸)
- ساغر صدیقی بستر سمیت ہوٹل سے غائب ہو گئے۔ (ص۱۸۵)
- ہماری ایک آنکھ ضرور پھوٹی لیکن اگلے کی دونوں پھوٹ گئیں۔ (ص۱۹۱)
- جوش صاحب ہمارے بعد میں پڑھنے پر خفا ہو گئے تھے۔ (ص۱۹۴)

مظفر وارثی کی آپ بیتی میں ملک کے سیاسی حالات، تاریخ اور واقعات تفصیل سے ملتے ہیں۔ ان کی آپ بیتی میں قاری کو طاہر القادری، ضیاء الحق، بے نظیر اور پرویز مشرف کا احوال پڑھنے کو ملتا ہے۔ جبکہ آفاق صدیقی کے ہاں صرف ایوب خاں کے دَور کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان دونوں آپ بیتیوں کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیاست ادب میں محض نعرے یا نظریے کے لیے استعمال نہیں ہوتی بلکہ سیاست کا ادب میں استعمال قاری کو

اس کے حقوق کی آگاہی دیتا ہے۔ شخصیت پرستی سے نجات دلاتا ہے اور مشاہیر کو قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور جاننے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ادیب معاشرے کا فرد ہوتا ہے۔ اس لیے معاشرے میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں اور نشیب و فراز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دوسری طرف آفاق صدیقی "ادبی سیاست" میں پڑنے کی بجائے اپنے کام پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ آفاق صدیقی نے اپنی آپ بیتی میں سیاست کا تذکرہ تو کیا ہے لیکن وہ ادب میں سیاست کو بالکل داخل نہیں ہونے دیتے ہیں بلکہ صرف اپنے عہد کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ وہ بہت زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کرتے ہیں۔ ادیب کا کام ادب میں سیاست کو شامل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا کام ادب کو ادب تک محدود رکھنا ہے۔۔ وہ سیاست کا تذکرہ سرسری اور ضرورتاً کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۵٦ء کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے صدیقی (۱۹) لکھتے ہیں:

> "٥٦ء کا آئین بنا۔ مملکت کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا مگر نام سے کیا ہوتا ہے۔"

صدیقی (۲۰) آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "اُس دَور میں کلاشنکوف کلچر نہیں تھا اور ہیروئن کے نام سے بھی بہت کم لوگ واقف تھے البتہ شراب نوشی پر کوئی پابندی نہ تھی۔"

اسی طرح ایک "پاکستانی سیاست" کے باب میں صدیقی (۲۱) ایک دل چسپ واقعہ لکھتے ہیں کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کی داغ بیل ڈالی۔ اس مقصد کے لیے چند اہلِ قلم کی خدمات بھی حاصل کیں اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے ممتاز ادباء اور صحافیوں کو لے کر کراچی سے پشاور تک دَورے کے لیے نکلے۔ یہ کارواں سکھر پہنچا۔ صدیقی صاحب رائٹر گلڈ کے مقامی سیکرٹری تھے۔ میٹنگ میں مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ کن اہل قلم کو سب سے آگے رکھا جائے صدیقی صاحب نے شیخ ایاز کا نام لیا کیونکہ وہ گلڈ کی مرکزی مجلس عاملہ کے رکن تھے لیکن ڈی سی صاحب نے کہا کہ شیخ ایاز لیفٹسٹ ہیں۔ صدیقی صاحب خاموش ہو گئے۔ جمہوریت اسپیشل ٹرین سکھر پہنچی تو فیلڈ مارشل ایوب خان کے پرائیویٹ سیکرٹری قدرت اللہ شہاب نے، جو رائٹر گلڈ کے جنرل سیکرٹری بھی تھے، جمیل الدّین عالی کی موجودگی صدیقی صاحب سے پوچھا کہ ایاز کہاں ہیں؟ انہوں نے کہہ دیا کہ ڈی سی صاحب کو اُن کی شمولیت پسند نہیں۔ فوراً ڈی سی صاحب کو بلایا گیا اور وہی سوال دہرایا گیا جس کا جواب ملا کہ سر وہ لیفٹسٹ ہیں۔ ابھی جواب پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ شہاب صاحب نے زور دے کر کہا کہ لیفٹسٹ تو ہماری گورنمنٹ بھی ہے اور فوراً ایاز صاحب کو بلوانے کے لیے کہا۔ آفاق صدیقی کی تو آفاق صدیقی اپنے موضوعاتی تنوع، مضبوط، استدلالی رویے اور

موضوعاتی فکری رجحانات سے نظریاتی وابستگی کے باعث منفرد دبستان کے مُوجد قرار پاتے ہیں۔ اُنھوں نے نہایت سادگی سے مِن و عن اپنی داستانِ حیات قلم بند کیا ہے۔ اُن کی یہ آپ بیتی ۱۹۹۳ء تک کے حالات و واقعات پر مبنی ہے۔ پوری آپ بیتی میں کسی جگہ وہ شاعرانہ تعلی کا شکار نظر نہیں آتے۔ اُن کی گفتگو علمیت اور سادگی کا عمدہ نمونہ ہے۔ صیغہ واحد متکلم میں لکھی گئی اُن کی خودنوشت "صبح کرنا شام کا" جدوجہد کی داستان ہے۔ اپنی مشکل حالات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہیں جھجھک کا شکار نہیں ہوتے۔ مظفر وارثی کی آپ بیتی کے مقابلے میں یہ آپ بیتی ویسے بھی مختصر ہے۔ بھارت یاترا سے متعلق اُن کے اشعار کی داستان بھی اس خودنوشت کا حِصہ ہے۔

- مظفر وارثی کی خودنوشت "گئے دِنوں کا سُراغ" صیغہ واحد متکلم میں لکھی گئی ہے۔ جگہ جگہ خودنوشت "میں" سے بھرپور ہے۔ اُنھوں نے اپنے لیے "ہم" کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ ہر بڑی شخصیت پر اُنھوں نے طنز کیا ہے اور اُن کے آس رہنے والا ہر کامیاب انسان اِن کا دشمن ہے اور اُن کی ٹانگ کھینچنے کے لے کوشاں ہے۔ جگہ جگہ اُنھوں نے اپنی شاعری اور اپنے طرزِ عمل کی خود سے تعریف کی ہے۔ قاری خودنوشت کا مطالعہ کرتے ہوئے مسلسل اپنے منھ میاں مٹھو کی کیفیت سے تنگ آجاتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ اپنی تعریف کرتے ہیں بلکہ وہ آس پاس کسی اور کو نہیں سراہتے بلکہ بد تعریفی کرتے ہیں اور اُن کو محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اُن کو نقصان پہنچانے کے دَرپے ہیں۔ افسانوی نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مظفر وارثی کی سرگزشت "گئے دِنوں کا سُراغ" نرگسیت کا نمونہ ہے جس کے بارے میں اختر (۲۲) اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

> "آپ بیتی میں نرگسیت کے اظہار کی جو صورتیں مل سکتی ہیں ان میں سرِ فہرست خود ساختہ اور پسندیدہ رنگ مرقع ذات، اپنی مبینہ خوبیاں اُجاگر کرنا اور اپنی مفروضہ یا حقیقی خامیوں کا تذکرہ، جنسی مہمات، مخالفین اور دشمنوں پر تبرا، نسب اور خاندان پر فخر اور اسلوب میں جذباتیت پر مبنی مبالغہ ہیں۔"

مظفر وارثی کی خودنوشت میں مندرجہ بالا تمام باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کا ایک مختصر سا نمونہ ملاحظہ کیجئے (۲۳) :۔

> "کیا ہم اور کیا ہمارے معمولات، ایک گنگار نے پارسائی کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے لیکن اللہ جانتا ہے، دھوکہ ہم ظاہر کو دیتے ہیں نہ باطن کو جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں صرف اس لیے کہ اہلِ میزان یہ نہ کہیں کہ یہاں ڈنڈی مار گیا۔"

بظاہر عاجزی، درویشی اور فقر کے پردے میں یہ بھی نرگسیت ہی کی ایک قسم ہے۔ اس کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے جب آفاق صدیقی کی خود نوشت "صبح کرنا شام کا" کا جائزہ لیتے ہیں تو سوائے دو تین سطروں سے ڈھونڈے سے بھی نرگسیت نہیں ملتی۔ آفاق صدیقی ایک محقق اور مترجم تھے شاید اس لیے بھی اُن کی خود نوشت میں اہلِ زبان والی صفائی تو ملتی ہے لیکن ادباء والی چاشنی نظر نہیں آتی۔ اُنھوں نے جزئیات نگاری سے کام لیا اور بس واقعات کو صداقت سے قلم بند کیا ہے۔ جبکہ مظفر وارثی کی خود نوشت میں اسلوبی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اُنھوں نے خود کو ثابت کرنے کے لیے خود نوشت کے آخر میں مختلف فہرستیں بھی درج کی ہیں۔ آپ بیتی کبھی مکمل نہیں ہوتی کیونکہ اُسے مصنف نے خود اپنی موت تک سے پہلے تحریر کیا ہوتا ہے اس لیے یہ ہمیشہ نامکمل ہوتی ہے۔

- آفاق احمد صدیقی کی خود نوشت مختصر ہے جو کہ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا اسلوب بھی سادہ اور آسان ہے۔ صدیقی صاحب نے اپنی آپ بیتی کو ۳۲ عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ آپ بیتی کا عنوان "بھائی محمود احمد خاں" کے نام پر ہے۔ آپ بیتی کے شروع میں کوئی پیش لفظ یا دیباچہ شامل نہیں ہے۔

مظفر وارثی کی خود نوشت طویل ہے جو ۲۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا اسلوب مشکل اور ادبی ہے۔ آپ بیتی کو ۵۳ عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کا انتساب "ماضی و فردا" کے نام سے ہے۔ آپ بیتی کے آغاز میں پیش لفظ "پیش اہنگ" کے نام سے دیا گیا ہے۔

- مظفر وارثی کا زیادہ ادبی سرمایہ شاعری میں ہے جبکہ آفاق صدیقی کا نثر میں ہے۔ دونوں کا انداز تحریر جدا اور منفرد تھا۔ دونوں کی آپ بیتیاں مشترک خصوصیات کے ساتھ ساتھ انفرادیت سے بھی معمور ہیں۔ مظفر وارثی کی آپ بیتی میں چند ایک خامیاں نمایاں ہیں جن میں تعلی، سیاست سے بہت زیادہ وابستگی اور خاندانی فخر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ واقعات کا طوالت کے ساتھ ذکر ہے جو آپ بیتی کے معیار اور مقام کو کمزور کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں آفاق صدیقی کی آپ بیتی اختصار کے ساتھ ان کے حالات وواقعات کو پیش کرتی ہے۔ مظفر وارثی کے مقابلے میں آفاق صدیقی کا اسلوب سادہ اور زبان آسان اور روزمرہ ہے۔ آفاق احمد صدیقی ۴۰ کے قریب کتب تحریر کی ہیں جن میں زیادہ نثر میں شامل ہیں۔ ۱۸ سندھی میں ہیں اور ۲۲ اردو میں ہیں۔ اردو کتب میں شعری مجموعے بھی شامل ہیں۔ مظفر وارثی نے آپ بیتی لکھنے کے علاوہ اپنا سارا ادبی کام شاعری میں چھوڑا ہے۔
- مظفر وارثی کھانے میں اُنھیں کڑھی، کوفتے، کریلے اور پائے مرغوب تھے۔ شوگر کے مریض تھے اور انسولین لگاتے تھے۔ دل کے مریض تھے اور معدے میں السر تھا۔ ریڑھ کی ہڈی کے مہرے بھی گھسے ہوئے تھے۔ بلا کے سگریٹ نوش تھے، پان بھی کھاتے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور باقاعدگی سے وظائف کرتے تھے۔ مطالعہ اور

لکھنا ان کے محبوب مشاغل تھے۔ آفاق احمد صدیقی کی آپ بیتی میں ہم آخر تک ان کو تندرست دیکھتے ہیں۔ وہ بچپن میں کچھ کھیل کود کے مشاغل رکھتے تھے جو انھوں نے جوانی میں ترک کر دیے تھے۔ آفاق صدیقی صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ زندگی میں آفاق صدیقی مظفر وارثی سے زیادہ خوش اور کامیاب نظر آتے ہیں۔

دونوں آپ بیتیاں نامکمل ہی سہی لیکن دو ممتاز ترین ادباء شعراء کی ذاتی زندگی کے حالات و واقعات سے پردہ اُٹھاتی ہیں۔ دونوں کی آپ بیتیاں تقسیم، فسادات اور ہجرت کے حوالے سے تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ کئی جگہ قاری یہ واقعات پڑھتے ہوئے اشکبار ہو جاتا ہے۔ مظفر وارثی کی آپ بیتی خاص طور پر پاکستانی کی سیاست کے پردہ اخفاء میں چُھپے کئی واقعات کو آشکار کرتی ہے۔ بقول ناقدین آپ بیتی ایک شدید داخلی صنف ہے، جس میں خارجی واقعات بھی داخلیت کے خلاف ہی پیش کیے جاتے ہیں۔ اختر (۲۴) رقم طراز ہیں:-

> "ایسے چہرے جن کا چہرہ ساز کو بھی شعور نہیں ہوتا، آپ بیتی کی غیر جانب دارانہ تحریر، واقعات کے درست ترین بیان، حالات کے بے لاگ تجزیے اور ان سب کو محدب شیشے میں رکھ کر اپنے قارئین کے حضور پیش کرنا آسان نہیں۔"

دونوں خود نوشتوں کا مطالعہ کرنے اور تقابلی جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ دونوں مصنفین نے "آپ بیتی" کی صنف کو اپنے اپنے انداز سے پیش کیا، اپنے رنگوں سے اس کو مزین کیا، صداقت، اسلوب اور تاریخی بیانیے کے انفال و انضمام سے قارئین کو اپنے عہد کے معرکوں، کشاکش خوابوں، آرزؤں، سیاست، سماجیات، معاشیات اور جدوجہد سے آگاہ کیا ہے۔ صنف کی موضوعاتی یک رنگی کے باوجود دونوں مصنفین کے ہاں فنی اور جمالیاتی سطح پر رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔

موازنہ انسانی ذہن، شعور اور فکر و نظر کو ذہنی بالیدگی بخشتا ہے۔ کسی تخلیق کی اچھائی یا برائی تب نظر آتی ہے جب اُس کا کسی دوسری ایسی چیز سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ موازنہ یا تقابل کھوٹے کھرے کی پرکھ ہے۔ "گئے دِنوں کا سُراغ" اور "صبح کرنا شام کا" اپنے وقت کی اہم خود نوشتیں ہیں۔ جن کی بصیرت اور بصارت کی سطحیں مختلف ہیں۔ دونوں آپ بیتی نگاروں نے اپنے انداز سے انھیں تحریر کیا ہے۔ یہ وقت کی اہم ضرورت تھی کہ ان کا تقابلی جائزہ لیا جاتا تاکہ ان کی ادبی قدر کا تعین کیا جاتا۔

حوالہ جات

۱۔ پرویز، شاہد، (۲۰۰۸ء)، تقابلی مطالعہ اور طریقہ کار، مشمولہ: اردو دنیا، جلد ۲، شمارہ ۷۸، ص ۲۱

۲۔ گیلانی، سیّدہ مسرت، (۲۰۱۸ء)، تقابلی مطالعہ کی شعریات (غیر مطبوعہ مقالہ) کشمیر یونیورسٹی، شعبہ اردو، ص ۱۷

۳۔ ابراہیم، محمد، (۲۰۰۳ء)، موازنہ اور اُس کے اصول، مشمولہ: ہمارا ادب، شمارہ ۹۲، ص ۳۵

۴۔ پرویز، شاہد، (۲۰۰۸ء)، تقابلی مطالعہ اور طریقہ کار، مشمولہ: اردو دنیا، جلد ۲، شمارہ ۷۸، ص ۲۲

۵۔ ایضاً، (ص ۲۲)

۶۔ جمال، نجیب، (۱۹۹۵ء)، بازگشت اردو خود نوشت کی انقلابی صورت، مشمولہ: کتاب کے بعد، لاہور، اظہار سنز، ص ۵۶

۷۔ پروازی، پرویز، (۲۰۰۷ء)، پس نوشت اور پس پسِ نوشت، لاہور، نیازمانہ پبلی کیشنز، ص ۱۵۱

۸۔ نبیل، انس، (ستمبر ۲۰۲۲ء)، مظفر وارثی کی نعتیہ شاعری میں عشقِ رسول اور انقلابی پہلو، مشمولہ: پیش رفت، نئی دہلی، ص ۴۳

۹۔ ملک، علی حیدر، (۱۹۹۵ء)، کراچی کا ادبی منظر نامہ، مشمولہ: اخبارِ جہاں کراچی، ص ۲۷

۱۰۔ وارثی، مظفر، (۲۰۰۰ء)، محولہ بالا، ص ۳۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۸

۱۲۔ صدیقی، آفاق، (۲۰۰۰ء)، محولہ بالا، ص ۲۰

۱۳۔ وارثی، مظفر، (۲۰۰۰ء)، محولہ بالا، ص ۲۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۰

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۶۔ وارثی، مظفر، (۲۰۰۰ء)، گئے دِنوں کا سُراغ، لاہور، خزینہ علم وادب، ص ۱۴۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۱۹۔ صدیقی، آفاق، (۲۰۰۰ء)، صبح کرنا شام کا، کراچی، طاہر پبلی کیشنز، ص ۵۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۳

۲۱۔ ایضاً، (ص ۶۲)

۲۲۔ سلیم، اختر، (۲۰۰۸ء)، آپ بیتی: مقاصد و محرکات، مشمولہ: قومی زبان، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان ص ۱۸

۲۳۔ وارثی، مظفر، (۲۰۰۰ء)، محولہ بالا، ص ۲۶۵

۲۴۔ سلیم، اختر، (۲۰۰۸ء)، محولہ بالا، ص ۲۲

ماحصل

آپ بیتی یا خودنوشت کو غیر افسانوی ادب میں شامل کیا جاتا ہے۔انگریزی میں اس کے لیے لفظ Autobiography استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ بیتی ایسی تحریر ہے جس میں لکھنے والا اپنی پوری زندگی (تادم تحریر) کی تفصیل خود قلم بند کرتا ہے۔ آپ بیتی کے تناظر میں آپ بیتی نگار اپنی داخلی اور خارجی زندگی کا مرقع پیش کرتا ہے۔ انسان سے متعارف ہونے کے لیے آپ بیتی سے تعارف حاصل کرنا ضروری ہے۔اردو ادب کی طرح اس صنف کی روایت بہت سی زبانوں میں ملتی ہے جن میں عربی، انگریزی اور فارسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اردو میں آپ بیتی کی روایت فارسی سے آئی ہے۔ اردو میں اس صنف کے ابتدائی نقوش روزناچوں، مکتوبات، سفر ناموں، تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہیں جہاں خودنوشت کے جزوی عناصر پائے جاتے ہیں۔ آپ بیتی کے دھندلے نقوش فورٹ ولیم کالج کی تالیفات کے دیباچوں میں نظر آتے ہیں۔اردو کے مشہور شاعر میر تقی میر نے فارسی میں اپنی خودنوشت "ذکرِ میر" کے عنوان سے لکھی۔ میر تقی میر کی خودنوشت نے اردو آپ بیتی کی روایت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔مولانا محمد جعفر تھانیسری کی آپ بیتی "کالا پانی" کو اردو کی پہلی باقاعدہ آپ بیتی تصور کیا جاتا ہے جس کا سن اشاعت 1884ء ہے۔بیسویں صدی کے صنف کے بعد اردو ادب میں اس صنف نے رواج پکڑا اور بہت سے شاعروں اور مصنفین نے اپنے حالات زندگی قلم بند کرنے کے لیے اپنی آپ بیتیاں لکھیں۔ تاحال آپ بیتی لکھنے کا سلسلہ شاعروں اور مصنفین کے ہاں جوش وخروش سے جاری وساری ہے۔

مظفر وارثی ۱۹۳۳ء میں میرٹھ (متحدہ ہندوستان) میں اپنے وقت کے مشہور شاعر وارثی میرٹھی کے ہاں پیدا ہوئے۔زمانے کے سرد وگرم برداشت کرتے ہوئے اور مشکل حالات سے لڑتے ہوئے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کی۔ تقسیم کے نتیجے میں اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کی اور پاکستان آگئے۔لاہور کو اپنی قیام گاہ بنایا۔ شعر وشاعری سے شروع ہی سے لگاؤ تھا کیونکہ اپنے والد کے ساتھ مشاعروں میں جایا کرتے تھے اور اُن کا لکھا ہوا کلام ترنم سے سُنایا کرتے تھے۔ کم کم ادیب ہی ایسے خوش بخت ہوتے ہیں کہ اُن کا پہلا تخلیقی کام ہی عوام وخواص میں پذیرائی حاصل کر لے۔ اُنھوں نے پہلی بار پاکستان کی فلم "ہم راہی" کے گیت لکھے جو بے حد مقبول ہوئے۔ اُنھوں نے کوئی ڈیڑھ درجن کے قریب فلموں کے گیت لکھے اور پھر نعت کی طرف متوجہ ہوگئے۔ عشق رسولؐ نے انھیں اپنی گرفت میں ایسا لیا کہ وہ فلمی دنیا سے مکمل طور پر کنارہ کش ہوگئے۔ مظفر وارثی طویل علالت کے بعد ۲۸ء جنوری، ۲۰۱۱ء کو ۷۷ برس کی عمر میں خالق حقیقی سے جاملے اور جوہر ٹاؤن لاہور میں ان کی نماز جنازہ محمد علی قصوری نے پڑھائی۔

مظفر وارثی نے اپنی آپ بیتی میں اپنی سماجی، سیاسی اور شعری زندگی کا ذکر کیا ہے۔ آپ بیتی کے آغاز میں انھوں نے اپنے خاندانی شجرہ نسب کا مکمل ذکر عمدگی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ ان کا گھرانہ سید ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی بھی تھا۔ خاندان کے زیادہ تر افراد پڑھے لکھے تھے۔ مظفر وارثی کے والد گرامی کو ادب سے لگاؤ تھا اور گھر میں ایک لائبریری بنا رکھی تھی۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے گھر سے حاصل کی اور قیام کستان کے بعد خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ لاہور کے ایک سکول سے میٹرک کرنے کے بعد شعر گوئی کے طرف راغب ہو گئے اور مختلف مشاعروں میں شرکت کرنے لگے جس سے آپ کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔، روزگار کے سلسلے میں اسٹیٹ بنک لاہور میں ملازم ہو گئے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ جاری رہا۔ شروع میں غزلیں اور گیت لکھے پھر نعت کی دنیا میں قدم رکھ کر شہرت کی بلندیوں کو سر کیا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انھیں سیاست سے بھی لگاؤ تھا۔ ان کی آپ بیتی میں بہت سی سیاسی شخصیات کا ذکر ملتا ہے جن میں نواز شریف، ضیاءالحق اور بے نظیر شامل ہیں۔ اس سے ہم اس دور کی سیاست کے بارے میں بھی آگاہی حاصل کرتے ہیں۔

مظفر وارثی نے کئی مشاعروں میں شرکت کی اور اپنے ہم عصر شاعروں سے ملے جن سے تعلقات کا اظہار ان کی آپ بیتی میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف پاکستان میں بلکہ ہندوستان کے بھی بہت سے مشاعروں میں شرکت کی اور اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ انھیں بہت سے ہندوستانی شاعروں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے ادبی سرمائے میں پندرہ نعتیہ مجموعے چھوڑے ہیں۔ تاہم نثر میں صرف ایک آپ بیتی "گئے دنوں کا سراغ "کے نام سے لکھی ہے۔ مظفر وارثی نے اگرچہ نثر میں صرف آپ بیتی لکھی ہے مگر ان کا اسلوب معیاری اور جامع ہے۔ ان کی آپ بیتی پڑھ کر ہم ان کے بچپن سے لے کر پختہ عمر ہونے تک کے اہم واقعات سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ مظفر وارثی کا نام ان کی آپ بیتی اور خاص کر ان کے نعتیہ کلام کی شہرت کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

آفاق صدیقی ۱۹۲۸ء کو متحدہ ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش کے علاقے فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کو شعر و ادب سے دل چسپی تھی۔ انھوں نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں تقسیم کے بعد سکھر آ کر آباد ہو گئے۔ یہاں انھوں نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ سکھر کے بعد آفاق صدیقی کراچی منتقل ہو گئے اور بقیہ زندگی یہیں بسر کی۔ ۱۷ جون ۲۰۱۲ء کو آفاق صدیقی نے ۸۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ بچپن میں جگر مراد آبادی ان کے گھر آیا کرتے تھے جس سے ان کے شوق کو مہمیز ملی۔ آفاق صدیقی کی مادری زبان اردو تھی لیکن فارسی اور سندھی پر بھی اُنھیں دسترس حاصل تھی۔ انھیں ترجے اور تحقیق سے لگاؤ تھا۔ انھوں چالیس کے قریب کتابیں تصنیف اور تالیف کیں جِن میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں

شاعری میں آفاق صدیقی کا نہایت اہم کارنامہ نعت گوئی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں انھوں نے رسالہ "کوہ کن" بھی نکالا۔ ۱۹۹۵ء میں ان کی آپ بیتی کا کچھ حصہ منظرِ عام پر آیا۔ ۲۰۰۰ء میں مکمل آپ بیتی "صبح کرنا شام کا" شائع ہوئی جِس میں ان کی زندگی کے ۱۹۹۳ء تک کے واقعات قلم بند کئے گئے ہیں۔ آفاق صدیقی نے اپنی آپ بیتی میں اپنے خاندان کے قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ ان کی آپ بیتی میں ملک کے سیاسی اور معاشی حالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ آپ بیتی میں خاندانی اور ملک کے سیاسی اور معاشی حالات کا ذکر کرنے کے علاوہ، انھوں اپنی شاعرانہ زندگی کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے سکھر اور کراچی کے علاوٗہ بہت سے شہروں میں ہونے والے مشاعروں میں شرکت کی اور بہت سے شاعروں سے ملے جن کا ذکر ان کی آپ بیتی میں ملتا ہے۔ پاکستان کے علاوہ انہوں نے دیگر ملکوں میں ہونے والے مشاعروں میں بھی شرکت کی۔ شاعری میں نعت گوئی ان کی شہرت کا باعث بنی۔

دونوں مشاہیر کی آپ بیتیوں کا موضوعاتی جائزہ لینے سے اُن میں موجود سیاسی، سماجی اور نفسیاتی عناصر کے علاوٗہ ہندوستانی تہذیب، تمدن، فسادات، تقسیم اور نوزائیدہ مملکت میں آبادکاری کے مسائل پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ دونوں ادیب حضرات میں عہد سمیت بہت سی چیزیں مشترک ہونے کے باوجود کئی افتراقات بھی موجود ہیں۔ آفاق صدیقی کی خودنوشت میں زندگی کے حقیقی مسائل، دُکھ، کرب، غربت اور مفلسی کی جھلک نمایاں نظر آتی ہیں۔ اُنھوں نے اپنی ذات اور آس پاس کے ماحول کا حقیقی عکس پیش کیا ہے۔ آفاق صدیقی اپنی داستان زندگی کا یہ کام صبر اور متانت کے ساتھ کرتے ہیں۔ دوسری طرف مظفر وارثی بھی تقریباً اِنھی حالات سے دوچار تو ہیں لیکن اُن کی خودنوشت میں واویلے کا انداز نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے جگہ جگہ انگشت نمائی کی ہے اور دوسروں کی خامیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ مظفر وارثی کی آپ بیتی میں تعلی پائی جاتی ہے۔ دونوں خودنوشتوں میں حقیقت نگاری موجود ہے۔ مظفر وارثی کے ہاں جذبات نگاری اور جزئیات نگاری بدرجہ اتم موجود ہے۔ جبکہ آفاق صدیقی کے ہاں یہ اہتمام نظر نہیں آتا۔

دونوں آپ بیتیوں میں انسان کو درپیش مسائل کا تذکرہ حقیقی انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ آپ بیتیاں اپنے عہد کی نمائندہ آپ بیتیاں ہیں جو معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ دونوں کے موضوعات میں کافی مماثلت ہیں لیکن سیاست کے معاملے میں دونوں ادیب حضرات کا نقطہ نظر مختلف ہے۔ مظفر واثی کی آپ بیتی میں جو عنصر سب سے نمایاں ہے وہ ان کا سیاسی شخصیات سے تعلق پر مشتمل ہے۔ انہوں نے نواز شریف، ضیاء الحق اور بے نظیر سے اپنے تعلقات کا واضح اور جامع اظہار کیا ہے جبکہ آفاق صدیقی کو سیاست سے اتنا لگاؤ نہ تھا۔ آفاق صدیقی نے صرف اپنی آپ بیتی میں ایوب خان کے بارے میں مختصراً ذکر کیا ہے۔ آفاق صدیقی نے بے تحاشا تحقیقی کام کیا ہے جو مظفر وارثی کے ہاں مفقود ہے۔

آفاق صدیقی نے کافی زیادہ نثری کتب لکھی ہیں لیکن مظفر وارثی نے نثر میں صرف آپ بیتی ہی تحریر کی ہے۔اگر نعتیہ مجموعوں کی تعداد کی بات کی جائے تو مظفر وارثی نے کثیر تعداد میں نعتیہ مجموعے چھوڑے ہیں جبکہ آفاق صدیقی نے قلیل تعداد میں نعتیہ مجموعے لکھے ہیں۔ آفاق صدیقی کے ہاں خود پرستی یا شاعرانہ تعلی ذرا بھی محسوس نہیں ہوتی لیکن مظفر وارثی کے ہاں یہ موجود ہے۔آفاق صدیقی کے ہاں داخلی کیفیت واضح جذباتی اظہار کی صورت میں سامنے آتی ہے لیکن مظفر وارثی کے ہاں داخلی کیفیات میں نفسیاتی کیفیت بھی مرکزی فکر سے ہم آہنگ ہے۔مظفر وارثی کی آپ بیتی میں لوگوں کے ناروا سلوک،اُن کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ، ظلم وزیادتی اور قریبی احباب کے بُرے سلوک کا تذکرہ کئی جگہ پر موجود ہے۔ان کے کرب اور تکالیف کی کیفیت اُن کی خودنوشت پر حاوی ہے۔

دونوں آپ بیتی نگاروں کو مشاعروں سے لگاؤ تھا اور باقاعدہ مشاعروں میں شرکت بھی کرتے تھے۔دونوں نے اپنے دور کے مشہور شاعروں سے اپنے تعلقات کا اظہار کیا ہے۔دونوں شاعروں کو نعت کی صنف سے خصوصی لگاؤ تھا۔ دونوں آپ بیتی نگاروں کو ان کے نمایاں کام کی وجہ سے تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا گیا تھا۔ آفاق صدیقی چونکہ نثر سے بھی لگاؤ رکھتے تھے،اس لیے ان کی آپ بیتی رواں اور آسان زبان میں ہے۔اس کے مقابلے میں اگر مظفر وارثی کے اسلوب کی بات کی جائے تو اس میں مشکل الفاظ کی بہتات ہے۔اسلوب کو معیاری بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔آفاق صدیقی نے اپنے حالات وواقعات کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے، جبکہ مظفر وارثی نے ہر بات کو تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔دونوں آپ بیتی نگاروں نے اپنی آپ بیتیوں کے عنوانات کو اشعار سے مستعار لیا ہے۔مظفر وارثی کی آپ بیتی کا عنوان غالب کی غزل کا مصرع ہے جبکہ آفاق صدیقی صاحب کی آپ بیتی کا عنوان ناصر کاظمی کی ایک غزل کا مصرع ہے۔دونوں شاعروں کی آپ بیتیاں اگرچہ مختصر ہیں مگر اپنے دور کے حالات وواقعات کا مکمل گھیراؤ کرتی ہیں،اختصار کا پہلو ہونے کے باوجود مکمل نظر آتی ہیں۔

دونوں شاعر تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کے سید اور ادبی گھرانوں میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد دونوں شاعروں نے پاکستان کے دو بڑے شہروں میں سکونت اختیار کی۔دونوں کے خاندان تقسیم ہند سے قبل خوشحال تھے اور قیام پاکستان کے بعد دونوں خاندانوں نے درمیانے درجے کی زندگی گزاری۔مظفر وارثی اور آفاق صدیقی چند سالوں کے فرق کے ساتھ پیدا ہوئے اور دونوں کے وفات کے سال میں بھی چند ایک سال کا فرق ہے۔اس طرح ان کا زمانہ قریب قریب ایک ہی ہے۔دونوں شاعروں کی آپ بیتیاں ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئیں۔

مظفر وارثی اور آفاق صدیقی دونوں کی آپ بیتیاں بہت سی مشترک خصوصیات رکھتی ہیں۔دونوں آپ بیتیاں خاندان کے مسائل، ہجرت کے دردناک مناظر، قیام پاکستان کے بعد آبادکاری کے مسائل اور روزگار کے مسائل کے ذکر سے بھرپور ہیں۔دونوں شاعروں کے ہاں عصری شعور نمایاں ہے۔وہ اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ گرد

و پیش سے بھی بے خبر نہ تھے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں فطرتاً حساس ہیں اور درد دل رکھتے ہیں۔دونوں شاعروں کی آپ بیتیاں بہت سے مشترک عناصر سے معمور ہیں ، دونوں میں خاندان کے ایک جیسے حالات اور مسائل کا ذکر ہونے کے ساتھ ساتھ، سیاسی اور شعری زندگی کا بھی واضح ذکر ہے۔خاندانی، سیاسی اور معاشی حالات دونوں میں تقریباایک جیسے ہی ہیں،بس بیان کرنے میں تھوڑابہت فرق ہے۔دونوں شاعروں کی مشترک خصوصیات میں ان کی مشکل حالات میں ثابت قدمی، سیاسی حالات سے وابستگی اور شاعری سے لگاؤ شامل ہیں۔ دونوں نے اپنے اردگرد کے حالات سے وابستہ اور باخبر رہ کر سماجی زندگی بسر کی۔مظفر وارثی مزاج کے لحاظ سے آفاق صدیقی سے زیادہ سخت گیر نظر آتے ہیں جبکہ آفاق صدیقی کے مزاج میں زیادہ ٹھہراؤاور برداشت دیکھائی دیتاہے۔

مظفر وارثی کا زیادہ ادبی سرمایہ شاعری میں ہے جبکہ آفاق صدیقی کا نثر میں ہے۔دونوں کی ایک مشترک خصوصیت ان کی نعت سے بے پناہ محبت تھی۔دونوں کا انداز تحریر جدااور منفرد تھا۔ دونوں کی آپ بیتیاں مشترک خصوصیات کے ساتھ ساتھ انفرادیت سے بھی معمور ہیں۔مظفر وارثی کی آپ بیتی میں چند ایک خامیاں نمایاں ہیں جن میں تعلی، سیاست سے بہت زیادہ وابستگی اور خاندانی فخر شامل ہیں۔اس کے علاوہ کچھ واقعات کا طوالت کے ساتھ ذکر ہے جو آپ بیتی کے معیار اور مقام کو کمزور کرتے نظر آتے ہیں۔ان کے مقابلے میں آفاق صدیقی کی آپ بیتی اختصار کے ساتھ ان کے حالات وواقعات کو پیش کرتی ہے۔مظفر وارثی کے مقابلے میں آفاق صدیقی کا اسلوب سادہ اور زبان آسان اور روزمرہ سے قریب تر ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

۱۔ صدیقی، محمد آفاق، (۲۰۰۰ء)، "صبح کرنا شام کا"، کراچی، طاہر پبلی کیشنز۔

۲۔ وارثی، مظفر، (۲۰۰۰ء)، "گئے دِنوں کا سُراغ"، لاہور، خزینہ علم و ادب الکریم مارکیٹ۔

ثانوی مآخذ:

۱۔ آزاد، ابو الکلام، (۱۹۹۰ء)، تذکرہ، مرتبہ مالک رام، دہلی، ساہیتہ اکادمی۔

۲۔ ابراہیم، محمد، (۲۰۰۳ء)، موازنہ اور اُس کے اصول، مشمولہ: ہمارا ادب، سری نگر، شمارہ، ۹۲۔

۳۔ ارسطو (۱۹۵۹ء)، سیاسیات از ارسطو (مترجم: سیّد نذیر نیازی)، لاہور، مجلس ترقی ادب۔

۴۔ احمد، شہزاد (۲۰۰۰ء) بحوالہ مظفر وارثی اور ان کی شاعری (رضیہ سلطانہ سحر)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی۔

۵۔ احمد، نبی، (س،ن)، اردو غزل میں ہجرت کا تجربہ، اسلام آباد، وفاقی اردو یونیورسٹی، فنون سائنس اور ٹیکنالوجی۔

۶۔ احمد، ندیم (۲۰۰۲ء)، بیسویں صدی میں خود نوشت سوانح عمری خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ، شمارہ ۱۲۹۔

۷۔ انصاری، یوسف جمال (۱۹۶۴ء)، آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں، لاہور، ادارہ فروغ اردو۔

۸۔ انور، قاضی صبیحہ (۱۹۸۲ء)، اردو میں خود نوشت سوانح حیات، لکھنؤ، نامی پریس۔

۹۔ پروازی، پرویز، (۲۰۰۷ء)، پس نوشت اور پس، پس نوشت لاہور، نیازمانہ پبلی کیشنز۔

۱۰۔ پروازی، پرویز، (۲۰۰۳ء)، پس نوشت اور پس پس نوشت: خود نوشتوں کا جائزہ، دیباچہ حصہ اوّل۔

۱۱۔ پرویز، شاہد، (۲۰۰۸ء)، تقابلی مطالعہ اور طریقہ کار، مشمولہ: اردو دنیا، جلد ۲، شمارہ

۱۲۔ جمال، نجیب (۱۹۹۵ء)، اردو خود نوشت کی انقلابی جہت، مشمولہ: کتاب کے بعد، لاہور، اظہار سنز۔

۱۳۔ جین، گیان چند (۱۹۸۹ء)، ادبی اصناف، گجرات، اردو اکادمی۔

۱۴۔ حسین، مجتبیٰ، (۱۹۹۷ء)، سرگزشت (مشمولہ: مشتاق احمد یوسفی، چراغ تلے سے آب گُم تک) مرتبہ حسیب، لاہور، الحمد پبلی کیشنز۔

۱۵۔ خانم، ریحانہ، (۱۹۶۴ء)، فن آپ بیتی اور آپ بیتیاں مشمولہ: آپ بیتی نمبر "الذبیر" بہاول پور۔

۱۶۔ سالک، علم الدین، (۱۹۶۴ء)، آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو، مشمولہ: نقوش (جلد اوّل) آپ بیتی نمبر، لاہور، ادارہ فروغِ اردو۔

۱۷۔ سُرور، آل احمد (۱۹۹۴ء)، خواب باقی ہیں، لاہور، فکشن ہاؤس۔

۱۸۔ سلیم، اختر، (۲۰۰۸ء)، آپ بیتی: مقاصد و محرکات، مشمولہ: قومی زبان، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان۔
۱۹۔ طفیل، محمد (۱۹۶۴)، تفریحات، مشمولہ: نقوش آپ بیتی نمبر، لاہور۔
۲۰۔ عامر سہیل، (۲۰۲۱ء)، جدید لسانیاتی اور اسلوبی تصورات، فیصل آباد، مثالی پبلشرز۔
۲۱۔ عبد القیوم (۲۰۰۷ء)، بحوالہ اردو نثر کا فنی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری (مرتب)، لاہور، الوقار۔
۲۲۔ عبد اللہ، سیّد، (۲۰۰۳ء)، اردو میں آپ بیتی، مشمولہ: اردو ادب کی فنی تاریخ از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور، الوقا
ر پبلی کیشنز۔
۲۳۔ عبد اللہ، سیّد (۱۹۶۴ء)، آپ بیتی، مشمولہ: نقوش (ادب آپ بیتی نمبر)، لاہور، ادارہ فروغ اردو ۔
۲۴۔ عبد اللہ، سید، (۲۰۰۳ء)، وجہی سے عبد الحق تک، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز۔
۲۵۔ علوی، وہاج الدّین (۱۹۸۹)، اردو خود نوشت فن و تجزیہ، نئی دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔
۲۶۔ علی، سیّد شاہ، (۱۹۶۱ء)، اردو میں سوانح نگاری، دہلی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس۔
۲۷۔ فاروقی، شمس الرحمٰن (۲۰۱۲)، افسانے کی حمایت میں، کراچی، شہر زاد اشاعت ۴ ۔
۲۸۔ فرخ، بشریٰ، (۲۰۲۲ء)، لڑکیاں بند کتابوں جیسی، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز۔
۲۹۔ فریدی، قمر الہدی (۲۰۱۰ء)، خود نوشت: محرکات اور فنی تقاضے، مشمولہ: نئی کتاب، نئی دہلی۔
۳۰۔ قریشی، جاذب، (۲۰۱۲ء)، عہد جدید کی نعت نگاری، مشمولہ: ادب کے تنقیدی نقوش، کراچی، نعت ریسرچ
سنٹر۔
۳۱۔ قسیم، اطہر، (۲۰۰۷ء)، آپ بیتیاں تحقیقی و تنقیدی جائزہ، اسلام آباد، NUST، مقالہ غیر مطبوعہ۔
۳۲۔ گیلانی، سیّدہ مسرت، (۲۰۱۸ء)، تقابلی مطالعہ کی شعریات (غیر مطبوعہ مقالہ) کشمیر یونیورسٹی، شعبہ اردو۔
۳۳۔ ملک، علی حیدر، (۱۹۹۵ء)، کراچی کا ادبی منظر نامہ، مشمولہ: اخبارِ جہاں کراچی۔
۳۴۔ مہر، غلام رسول، (۱۹۶۴ء)، آپ بیتیوں کی اہمیت، مشمولہ: آپ بیتی نمبر، لاہور۔
۳۵۔ مہر، غلام رسول، (۲۰۱۹)، نوائے سروش مکمل دیوان مع شرح، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز۔
۳۶۔ نبیل، انس، (ستمبر ۲۰۲۲ء)، پیش رفت، نئی دہلی۔
۳۷۔ ندوی، ابو الحسن علی (۱۹۹۶ء)، آپ بیتی مولانا عبد الماجد دریا آبادی (پیش لفظ)، کراچی، مجلس نشریات اسلام۔
۳۸۔ نیر، ناصر عباس (۲۰۱۵ء)، یادوں کی برات نفسیاتی تناظر میں، مشمولہ: سہ ماہی، بنگلور کرناٹک، اردو اکادمی۔
۳۹۔ وارثی، مظفر (۱۹۹۳) کھلے دریچے بند ہوا، لاہور، القمر انٹرپرائزرز۔
۴۰۔ ورک، اشفاق احمد (۲۰۰۵ء)، خاکہ اور خود نوشت، لاہور، بیت الحکمت۔

۴۱۔ہاشمی،رفیع الدین(۲۰۰۸ء)،اصنافِ ادب،لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز۔

۴۲. Abraham, M.H (1999) A Glossary of Literary Term, USA, Eavi Mcpeek.

۴۳. Lejeune, P (1989) On autobiography (Katherine of Minnesota Press.

لغات و قاموس:

- اختر، سلیم،(۲۰۱۰ء)،تنقیدی اصطلاحات،لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز۔
- خویشگی، محمد عبداللہ،(۲۰۰۷ء)، فرہنگ عامرہ،اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان۔
- صدیقی،ابوالاعجاز حفیظ،(۲۰۱۸ء)،کشاف تنقیدی اصطلاحات،اسلام آباد،ادارہ فروغ قومی زبان۔
- عتیق اللہ،(۱۹۹۵ء)،ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، نئی دہلی، بھارت،انجمن ترقی اردو بیورو۔
- فرہنگ اصطلاحات،(لسانیات)،(۱۹۸۷ء)، نئی دہلی،ترقی اردو بیورو۔

مقالہ جات:

- بانو، مسرت،(۲۰۱۶ء)،پاکستانی ادباء کی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں تاریخی اور تہذیبی شعور(۱۹۴۷ء تا حال)، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو) یونی ورسٹی آف سرگودھا۔
- قسیم،اطہر،(۲۰۰۷ء)،اردو ادب کی آپ بیتیاں تحقیقی و تنقیدی جائزہ، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)،اسلام آباد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز۔

رسائل و جرائد:

- اردو جرنل،(۲۰۱۲ء)،شعبہ اردو پٹنہ یونی ورسٹی۔
- الزبیر،(۱۹۶۴ء) آپ بیتی نمبر۔
- بازیافت،لاہور، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی
- نقوش(۱۹۶۴ء) آپ بیتی نمبر۔
- نئی کتاب(۲۰۱۱ء)، دہلی۔
- نیاسفر،(۱۹۹۷ء)،الہ آباد۔

مظفر وارثی

گئے دِنوں کا سُراغ

حصار
مظفر وارثی
مظفر وارثی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
منفرد و ممتاز غزل گو نعت گو شاعر
مظفر وارثی
موت کے گھر میں پڑی ہے زندگی کی ایک بھول
یا تجوری میں زمیں کی، خاکِ دہلیزِ رسولؐ!
بارگاہِ حق سے چُن کر لاتی رہتی ہے ہوا!
کرتی رہتی ہے نچھاور قبر پر رحمت کے پھول
تاریخ پیدائش ۲۳ دسمبر ۱۹۳۳ء
تاریخ وفات، ۲۸ جنوری ۲۰۱۱ء

یا اللہ
یا محمد
بسم اللہ الرحمن الرحیم
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
ہاشمی بیگم
زوجہ
مظفر وارثی

خود نوشت
"صبح کرنا شام کا"
آفاق صدیقی

پروفیسر آفاق صدیقی
اور
سندھی ادب
حبیب الرحمن
پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی

اور نگ
سلیماں
پروفیسر سید فخر الحسن
آفاق صدیقی
مجلس علوم اسلامیہ کراچی

"صبح کرنا شام کا"
آفاق صدیقی

پیامِ لطیف
اردو تراجم